Phone: 7500

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اپریل 1962ء

بیادِ اقبالؒ

شائع کردہ:

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گل برگ لاہور

قیمت ۷۵ پیسے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک	قیمت فی پرچہ	ٹیلیفون نمبر ۷۵۰۰
ہندوپاکستان سے سالانہ آٹھ روپے غیر ممالک سے سالانہ ۱۶ شلنگ	ہندوپاکستان سے ۷۵ نئے پیسے	خط وکتابت کا پتہ ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

جلد ۱۵	اپریل سنہ ۱۹۶۲ء	نمبر ۴

فہرست مضامین

پیغامِ اقبالؒ ——— ۲
لمعات ——— ۳
طلوعِ اسلام کنونشن ——— ۱۰
رابطہ باہمی ——— ۱۱
اقبالؒ کا پاکستان ——— ۱۵
دُرِّ منثور ——— ۲۵
کافرگری ——— ۳۳
حقائق وعبر ——— ۷۷

پیغامِ

اقبالؒ

منزل و مقصودِ قرآں دیگر است — رسم و آئینِ مسلمان دیگر است

در دلِ او آتشِ سوزندہ نیست — مصطفیٰؐ در سینۂ او زندہ نیست!

بندۂ مومن ز قرآں برنخورد — در ایاغِ او نہ مے دیدم نہ دُرد

خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست — خود سرِ تختِ ملوکیت نشست!

تا نہالِ سلطنت قوت گرفت — دینِ او نقش از ملوکیت گرفت

از ملوکیت نگہ گردد دگر
عقل و ہوش و رسم و رہ گردد دگر!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

دین کا مقصود و منتہیٰ کیا ہے، اسے حکیم الامت، علامہ اقبالؒ نے چار لفظوں میں سمٹا کر رکھ دیا جب کہا کہ

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے

حیوانات اپنی دنیا میں غلامی کے تصور تک سے ناآشنا ہیں۔ یہ "شرف" ابن آدم ہی کے حصے میں آیا ہے کہ ایک انسان، دوسرے انسان کو اپنا غلام بنا رہا ہے۔ غلامی کی بے شمار قسمیں ہیں ——— ہمارے زمانے میں بیشتر ممالک میں جس غلامی (Slavery) کو قانوناً ختم کیا گیا ہے، وہ اس کی صرف ایک شکل ہے ——— اگر اس کی اصولی تقسیم کی جائے تو یہ تین بڑی بڑی شاخوں میں بٹ جاتی ہے و (۱) معاش کی غلامی۔ (۲) عمل کی غلامی اور (۳) فکر کی غلامی۔ معاش کی غلامی میں ایک انسان، دوسرے انسان کو اس کا حق نہیں دیتا کہ وہ اپنی محنت کے ماحصل کا آپ مالک ہو۔ عمل کی غلامی میں، دوسروں کو حق نہیں دیا جاتا کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق کچھ بھی کر سکیں۔ اور فکر کی غلامی میں اس کا حق نہیں دیا جاتا کہ کوئی شخص آزادانہ کچھ سوچ سکے۔ معاشی غلامی کا علمبردار نظام سرمایہ داری ہے۔ عمل کی غلامی، ملوکیت میں عام ہوتی ہے۔ اور ذہنی و فکری غلامی، مذہبی پیشوائیت کا نتیجہ۔ قرآن کریم نے داستانِ بنی اسرائیل میں، غلامی کی ان تینوں اصولی انواع کا ذکر، قارون۔ فرعون اور ہامان کی صورت میں کیا ہے ——— قارون نظام سرمایہ داری کا نمائندہ۔ فرعون، استبداد و ملوکیت کا مجسمہ۔ اور ہامان، مذہبی پیشوائیت کا ترجمان۔ دین ان تینوں کو مٹانے کے لئے آتا ہے ——— معقول انسانوں کے لئے "ید بیضا" ——— دلائل و براہین نیرہ کے ذریعے۔ اور سرکش اور جابر لوگوں کے لئے "عصائے کلیمی" ——— بلال و جبروت کی رو سے۔

دین کی تاریخ عجیب ہے۔ خدا کا ایک رسول، خدا کا دین لے کر آتا۔ اور انسانوں کو غلامی کی زنجیروں سے چھڑا کر، قوانین الٰہیہ کے مطابق، سرفرازی و سربلندی کی زندگی بسر کرنا سکھاتا۔ وہ چلا جاتا تو استبداد کی یہ قوتیں پھر سر نکالتیں اور اپنے کھوئے اقتدار کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے مختلف حربے استعمال کرتیں۔ ان میں سب سے زیادہ موثر حربہ، مذہبی پیشوائیت کی طرف سے استعمال کیا جاتا۔ یہ لوگ اُس دین کی جگہ، جسے خدا کا رسول دیکر گیا تھا، ایک بنا دین وضع کرتے، اور اس پر اصلی دین کا لیبل لگا کر، لوگوں میں عام کر دیتے۔ اس وضع کردہ دین میں، سرمایہ داری، ملوکیت اور برہمنیت کو نمایاں مقام حاصل ہوتا۔ جب غلامی کا یہ فساد عام ہو جاتا تو خدا کی طرف سے ایک اور رسول آجاتا اور وہ پھر دینِ خداوندی کو اس کی حقیقی اور اصلی شکل میں پیش کرتا۔ استبداد کی قوتوں کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوتی۔ مذہبی پیشوائیت، اس مخالفت میں پیش پیش ہوتی۔ یہ لوگ عوام کو یہ کہہ کر بہکاتے کہ حقیقی دین وہی ہے جو ان کے آباؤ اجداد سے منتقل ہوتا آرہا ہے اور جس کے محافظ اور نمائندہ یہ خود ہیں۔ اور جو دین اس داعی کی طرف سے پیش کیا جا رہا ہے، وہ اختراع اور افتراء ہے حضرت عیسیٰؑ کے خلاف یہودی احبار و رہبان کی طرف سے جو موت کا فتویٰ صادر ہوا تھا، تو وہ دین اور مذہبی پیشوائیت کی اس کش مکش کا نتیجہ تھا۔ اور یہودیوں اور عیسائیوں کی طرف سے خود نبی اکرمؐ کی جو اس قدر شدید مخالفت ہوئی تھی تو وہ بھی اسی کش مکش کی آئینہ دار تھی۔

یہی کش مکش دنیا میں آج بھی جاری و ساری ہے۔ یورپ نے جب مذہبی پیشوائیت کے استبداد سے تنگ آکر، ذہنی اور فکری آزادی حاصل کرنی چاہی، تو اسی پیشوائیت کی طرف سے اس کی جس قدر مخالفت ہوئی، تاریخ کے اوراق اس پر شاہد ہیں۔ اقوامِ یورپ کو اس کش مکش میں کامیابی حاصل ہوئی لیکن چونکہ ان کے پاس خدا کا دین اپنی اصلی شکل میں تھا نہیں، اور بابِ نبوت کے بند ہو جانے کی وجہ سے[1] کوئی نبی ان کی طرف آنہیں سکتا تھا۔ اس لئے ان کے اعتدال پسند طبقہ نے، مذہب سے سمجھوتا کر کے اس کے دائرۂ اثر و نفوذ کو گرجے کی چار دیواری تک محدود کر دیا، اور زندگی کے معاملات اپنی تحویل میں لے لئے ـــــ مغربی جمہوریتیں اسی سمجھوتے کی مظہر ہیں ـــــ اور متشدد طبقہ نے مذہب سے یکسر سرکشی اختیار کر کے، مذہب دشمنی کو اپنا شعار بنا لیا ـــــ روس کی کمیونزم اسی تشدد پسندی کا نتیجہ ہے۔ دین بہرحال وہاں کسی کے پاس نہیں۔ نہ گرجے کے پادری کے پاس۔ نہ "خدا پرست" یورپ کے پاس اور نہ خدا

---

[1] بابِ نبوت کے بند کر دینے کے بعد دنیا کے سامنے خدا کا دین، اس کی اصلی شکل میں پیش کرنے کا فریضہ اس امتِ مسلمہ کے سپرد کیا گیا تھا جسے خدا نے اپنی آخری اور مکمل کتاب کا وارث بنایا تھا۔ لیکن جب وہ امت خود ہی اس کتاب کو چھوڑ کر ہر قسم کی غلامی میں ماخوذ ہو چکی ہو، تو دنیا کے سامنے دینِ خداوندی کو کون پیش کرے!

کے منکر روس کے ہاں۔ وہاں دین کے نہ ہونے کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے اگرچہ مذہبی پیشوائیت کی غلامی کی زنجیروں سے اپنے آپ کو چھڑا لیا ہے، لیکن دوسری زنجیروں میں، پہلے سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ جکڑے ہوئے ہیں ــــ جمہوریتیں، سرمایہ داری، استعماریت اور نسل پرستی کی زنجیروں میں، اور کمیونزم، ملوکیت کے آمرانہ استبداد کی زنجیروں میں ــــ یاد رکھئے جس طرح لادینی کا نام سیکولرازم رکھ دینے سے "خدا پرستی" نہیں آجاتی، اسی طرح زارِ روس کا نام مزدوروں کا ڈکٹیٹر رکھ دینے سے، ملوکیت کا استبداد ختم نہیں ہو جاتا ــــ

اس کش مکش کے آثار اب عالمِ اسلامی میں بھی پائے جاتے ہیں۔ زمانے کے تقاضوں سے، طبائع اب معاش، عمل اور فکر کی آزادی کے لئے مضطرب و بے قرار ہیں۔ ان کی اس طلب اور تڑپ کو کوئی قوت روک نہیں سکتی۔ بعض پسند قوتیں، حسبِ معمول، ان کی اس آرزو اور طلب کی سخت مخالفت کر رہی ہیں مسلمانوں کے ہاں دینِ حقیقی، خدا کی کتاب میں حرفاً حرفاً محفوظ ہے، لیکن ان قوتوں کی پوری کوشش یہ ہے کہ یہ دین سامنے نہ آنے پائے۔ اگر یہ دین سامنے نہ آنے پایا تو ان کے ہاں بھی وہی کیفیت پیدا ہو جائے گی جو یورپ اور روس میں ہوئی ہے یعنی ان کا معتدل طبقہ، مذہب کو مساجد کی چار دیواری تک محدود کر کے، زندگی کے معاملات کے لئے سیکولر نظام اختیار کرے گا۔ اور متشدد طبقہ کمیونزم کے آغوش میں چلا جائے گا۔ مسلمانوں کے اکثر ممالک میں یہ کچھ ہو رہا ہے، اور باقی ممالک میں ایسا کچھ ہونے کے امکانات نظر آرہے ہیں۔ اگر ایسا ہو گیا، تو جس جہنم میں دوسری قومیں مبتلائے عذاب ہیں، اس میں یہ بھی داخل ہو جائیں گے ــــ بلکہ ان کی حالت، اُن سے بھی ابتر ہو گی ــــ جہنم کی آگ کو خود سلگانے، اور دوسروں کی سلگائی ہوئی آگ میں جل کر بھسم ہو جانے میں فرق ضرور ہوتا ہے ــــ امامت (لیڈرشپ) خواہ کفر ہی کی کیوں نہ ہو، اس میں لذت ہوتی ہے۔ بدر کے میدان میں جب ایک مسلمان مجاہد، ابوجہل کا سر کاٹنے لگا تو اس نے کہا تھا کہ اسے اوپر نیچے سے کاٹو تاکہ جب لڑائی کے بعد مقتولین کے سروں کو نیزوں پر چڑھا کر ان کا جلوس نکالا جائے، تو میرا سر باقیوں سے، اونچا نظر آئے۔

دینِ خداوندی نے ایک دن غالب آکر رہنا ہے ــــ اس لئے کہ انسانیت کی مشکلات (problems) کا حل اس کے سوا اور کہیں سے نہیں مل سکتا۔ لیکن اس دوران میں انسانیت جس جہنم میں مبتلا رہے گی، اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ انسانیت کے خلاف یہ وہ جرمِ عظیم ہے جس کی سزا اس امت کو بھگتنی پڑے گی جسے دینِ خداوندی (قرآن مجید) کا وارث اور نوعِ انسانی کا نگہبان (شاہد) بنایا گیا تھا ــــ ہم ذلت و رسوائیوں کے جس عذاب میں مدت سے مبتلا چلے آرہے ہیں، وہ اسی جرم کی سزا ہی تو ہے۔ اس سزا میں اور اضافہ ہوتا چلا جائے گا

دین کے سمجھنے اور اسے دوسروں کے سامنے پیش کرنے کا کام، قوم کے تعلیم یافتہ طبقہ کا تھا۔ اس لئے کہ دین کو سمجھ وہی سکتا ہے جو اس سطح پر کھڑا ہو جہاں تک اُس کے زمانے میں انسانی علم پہنچ چکا ہے۔ اور دین کو پیش وہ کر سکتا ہے جو اپنے زمانے کے تقاضوں سے واقف ہو ـــــ لیکن ہماری بدقسمتی ہے کہ اہلِ مغرب کی دیکھا دیکھی، ہمارا تعلیمیافتہ باہوش طبقہ (Intelligentsia) دین کی طرف سے بے اعتنائی (Indifferent) ہو چکا ہے۔ اہلِ مذہب کی، مذہب کی طرف سے بے اعتنائی کا یہ عالم ہے کہ (تقسیم سے پہلے) سکریٹریٹ کے دفتر میں ایک سپرنٹنڈنٹ تھا۔ ایک دن ایک مسلمان کلرک نے اُسے کچھ پمفلٹ دینے چاہے۔ اس نے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ اس نے کہا کہ یہ مذہب سے متعلق لٹریچر ہے۔ اس نے جواب میں کہا کہ اسے پادری کو دیجئے۔ اسے اس کی تنخواہ ملتی ہے۔

ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کی ذہنیت بھی کچھ ایسی ہی ہو چکی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ طبقہ "مذہب گزیدہ" ہے لیکن اسے "مذہب" اور "دین" میں فرق کرنا چاہیئے۔ مغرب کا تعلیم یافتہ طبقہ اگر مذہب سے بے اعتنائی برتتا ہے تو اس سے اس کے دنیاوی معاملات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لیکن یہاں صورتِ حالات بالکل مختلف ہے۔ یہاں ہمارے آئین کی رو سے، دنیا کا کوئی معاملہ ایسا نہیں ہوگا جو مذہب کے تابع نہیں رہے گا ـــ ہمارے آئین میں یہ شق موجود ہے کہ پاکستان میں کوئی قانون ایسا نافذ نہیں ہوگا جو اسلام کے خلاف ہو۔ اس لئے اگر ہمارے ہاں کے تعلیم یافتہ طبقہ نے دین سے بے اعتنائی برتی تو اس کا جو نتیجہ ہوگا وہ ظاہر ہے۔ افلاطون نے جب تعلیم یافتہ طبقہ کی سیاسیات سے بے اعتنائی دیکھی تھی تو ان سے کہا تھا کہ

> اگر تم نے یہی روش رکھی تو فطرت کی طرف سے تمہیں اس کی یہ سزا ملے گی کہ تم سے کم عقلمند اور کم قابل لوگ تم پر حکومت کرنے لگ جائیں گے۔

ہمارے ہاں دین اور سیاست دو چیزیں نہیں۔ اس لئے جو کچھ افلاطون نے سیاسیات کے متعلق کہا تھا، ہمارے ہاں وہ دین پر صادق آتا ہے۔

کیا ہم ملک کے تعلیم یافتہ، ہوشمند طبقہ سے اس کی توقع کریں کہ وہ اس صورتِ حالات پر سنجیدگی سے غور کریگا اور اس غلط ذہنیت کو جھٹک کر الگ کر دیگا جس کی رو سے اس سپرنٹنڈنٹ نے کہا تھا کہ مذہبی لٹریچر سے میرا کوئی تعلق نہیں، یہ پادری کے محکمہ کی بات ہے۔ وہ تو حق بجانب تھا۔ اس لئے کہ حضرت علامہؒ کے الفاظ میں

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی	سماتی کہاں اس فقیری میں میری
خصومت تھی سلطانی و راہبی میں	کہ وہ سربلندی ہے یہ سربزیری

اس لئے۔

سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا چلی کچھ نہ پیرِ کلیسا کی پیری

لیکن۔

ہوئی دین و دنیا میں جس دم جدائی ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری
دوئی ملک و دیں کے لئے نامرادی دوئی چشمِ تہذیب کی نابصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا بشیری ہے آئینہ دارِ نذیری
اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی
کہ ہوں ایک جنیدی و اُردشیری

تعلیم یافتہ طبقہ کی دین سے بے اعتنائی سے حالت پہلے ہی یہ ہو چکی ہے کہ
زاغوں کے تصرف میں ہیں شاہیں کے نشیمن

اب اگر ان بدلے ہوئے حالات میں بھی ان کی روش یہی رہی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہماری زندگی کے ہر شعبہ پر جہالت غالب آجائے گی۔ اور گوئٹے کے الفاظ میں

There is no more terrible sight than
ignorance in action.

جب جہالت روبہ عمل ہو، تو اس سے زیادہ تباہ کن منظر اور کوئی نہیں ہوتا۔

سرِ خاکِ شہیدے برگ ہائے لالہ می پاشم

بالآخر ۱۸ مارچ کو حکومتِ فرانس اور الجزائری قوم پرستوں کی نمائندہ عبوری حکومت کے مابین متارکۂ جنگ کے صلحنامہ پر دستخط ہو گئے اور اس معاہدہ کی بدولت الجزائر کی صبحِ آزادی کی وہ منزل قریب آگئی جس کے لئے اس سرزمین کا چپہ چپہ خونِ شہیداں کی گلکاریوں سے مالامال ہوتا رہا۔ ۱۸۳۰ء میں الجزائر کو فرانسیسی سامراج کے چنگل میں گرفتار ہونا پڑا اور اس کے سوا سو سال بعد ۱۹۵۴ء میں، یہاں تحریکِ استخلاصِ وطن کی وہ جنگ شروع ہو گئی جس کی خوں فشانیوں کی نظیر تاریخ کے اوراق میں شاید ہی کہیں مل سکے۔ اس دن سے کر آج تک مجاہدینِ الجزائر کو فرانسیسی سامراج کے ظلم و بربریت کے جن تہلکوں سے گزرنا پڑا، اور جن عیاریوں اور مقاتلوں کا جو سلسلۂ دراز ایک سو تیس برس کی اس طویل

مدت میں بربار ہا اس کا آج اندازہ لگانا ممکن نہیں، صرف اواخر ۱۹۵۴ء سے (جبکہ یہ جدوجہد ایک نئے اور منظم طریق سے شروع ہوئی) اب تک جو اعداد و شمار سامنے آئے ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ ساڑھے سات برس کی اس مختصر سی مدت میں دس لاکھ مجاہدین میدانِ جنگ میں لڑتے لڑتے کام آئے۔ دس ہزار کے قریب جنگی قیدیوں کی حیثیت سے قید و بند کی بدترین صعوبتوں کا شکار چلے آرہے ہیں[1]۔ بیس لاکھ کاشتکاروں کو قیدیوں کے کیمپوں میں منتقل کیا گیا۔ پانچ لاکھ کے قریب گھر بار چھوڑ کر جنگلوں، پہاڑوں اور بیابانوں میں پناہ تلاش کرتے پھرے۔ چار لاکھ کے قریب جلا وطنی کے عالم میں جانیں چھپائے پھر رہے ہیں ـــــ جن مردوں اور عورتوں کو ہزاروں کی تعداد میں گرفتار کر کے بدترین تشدد اور بربریت کا شکار بنایا گیا ان کی داستانِ خونچکاں الگ ہے۔

یہ اعداد و شمار گزشتہ سات ساڑھے سات برس کی مختصر مدت سے متعلق ہیں۔ ۱۸۳۰ء سے اب تک ایک سو تیس برس میں مسلسل طور پر جو کچھ ہوا اس کا اندازہ لگا لیجئے جس قوم کو اس قدر بے مثال قربانیوں کے بعد آزادی حاصل رہی ہو اس کی آزادی کی قدر و قیمت کو سمجھنا مشکل نہیں۔ دنیا کا ہر حریت پسند انسان اور ہر مسلمان آج دل کی گہرائیوں سے اسلامیانِ الجزائر کو اس ساعتِ سعید پر ہدیۂ تبریک پیش کرے گا اور اسی مخلصانہ احساس کے تحت ہمارے قلوب بھی آج بہجت و مسرت سے لبریز ہیں اور ہم الجزائری بھائیوں کو بخلوصِ قلب مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ قوموں کی زندگی میں یہ مرحلہ بڑا ہی نازک ہوتا ہے۔ الجزائر کے سرفروشوں نے بے مثال جدوجہد کے بعد ایک خطۂ زمین حاصل کیا ہے۔ اس خطۂ زمین میں وہ اپنے لئے اور آئندہ نسلوں کیلئے کس قسم کا نظامِ حیات قائم کرتے ہیں؟ یہ ہے وہ اہم سوال جس پر مجاہدین الجزائر کی بے مثال قربانیوں کے مستقبل کا انحصار ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ الجزائر کے باردگرد بعض مسلم ممالک میں عرب نیشنلزم کے نعرے زور و شور سے بلند ہو رہے ہیں اور اس طرح کروڑوں مسلمانوں کو ایک ایسے تصورِ حیات کی طرف لایا جا رہا ہے جو اسلام اور اس کے نظریۂ اخوت کے سراسر منافی ہے۔ ایسی صورتِ حال میں اپنے مستقبل کے سلسلے میں بنیادی مسائل طے کرتے ہوئے اسلامیانِ الجزائر اور ان کے رہنماؤں کو انتہائی شعور اور بصیرت سے کام لینا ہوگا۔ الجزائر کے مستقبل کا انحصار اسلامیانِ الجزائر کے اس فیصلہ پر ہے کہ اس بے مثال جدوجہد کے بعد ان کے نظامِ حیات کی اساس کیا ہو۔ ظاہر ہے کہ حلقہ بگوشانِ اسلام کی حیثیت سے خدا کی آخری کتاب ہی ان کا ضابطۂ حیات بن سکتی ہے۔ چنانچہ ہمیں یقین ہے کہ اس سرزمین پر قرآن کا عطا فرمودہ نظام قائم ہو گیا تو نہ صرف اسلامیانِ الجزائر کو اپنی بے مثال قربانیوں کا

---

[1] ان کی رہائی کا سلسلہ اب صلحنامہ کے تحت شروع ہو گیا ہے۔

حلہ مل جائے گا بلکہ اس کے صدقے میں اس سرزمین میں جنت ارضی کی وہ بساط بچھ جائے گی جس کی تلاش میں آدم مارا مارا پھر رہا ہے۔ یہی ہوگا وہ نظام جس کی صبح بہار کی کرنیں اپنی برکتوں کے جلو میں چاروں طرف پھیلتی چلی جائیں گی اور بھٹکی ہوئی نوع انسانی کے لئے روشنی کا مینار ثابت ہوں گی۔ خدا کرے کہ امجزائم کے سلمان اس مقصد عظیم کو پورا کر سکیں۔ اس لئے کہ

یہی کچھ ہے مقصود و مطلوب مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

۳

پاکستان کے جدید آئین کے سلسلہ میں اس ماہ میں اس قدر سامنے آچکا ہے کہ اس کے تعارف یا وضاحت کے لئے کچھ اور لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اب تو یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس پر عمل کس طرح ہوتا ہے اور اس کے نتائج کیا برآمد ہوتے ہیں۔ چونکہ طلوعِ اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے (نہ تھا) اور نہ ہی یہ ایک تحریک کی حیثیت سے عملی سیاست میں حصہ لیتا ہے اس لئے اس کی طرف سے انتخابات وغیرہ میں عملی شرکت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ جو لوگ اپنے طور پر ایسا کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں ان سے ہم عرض کریں گے کہ وہ پاکستان کے استحکام، ملت کی وحدت اور صحیح اسلام کی تنفیذ کو اپنا نصب العین قرار دیں۔

کہ یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

طلوعِ اسلام کا آئندہ شمارہ

کنونشن نمبر ہوگا۔ اندازہ ہے کہ حسب معمول یہ دُگنے سائز کا ہو جائے گا اور شروع مئی میں قارئین کی خدمت میں پہنچ جائے گا۔ اگر اس میں دو چار دن کی تاخیر ہو جائے تو اس کا خیال نہ فرمائیں۔

(ناظم ادارہ)

طلوعِ اسلام کنونشن

سنہ ۱۹۶۲ء

۱۳-۱۴-۱۵- اپریل کو حسب سابق لاہور میں منعقد ہو رہی ہے۔ اس سلسلے میں تمام بزموں کے نام پہلا سرکلر جاری کیا جا چکا ہے۔ جن بزموں کو کسی وجہ سے یہ سرکلر موصول نہ ہوا ہو وہ ادارہ کو فوری طور پر مطلع کریں کنونشن میں شرکت صرف اسی سرکلر کے مطابق ہو سکے گی۔

پروگرام کے سلسلے میں دوسرا سرکلر اپریل کے پہلے ہفتے جاری کر دیا جائیگا

(ناظم ادارہ)

پرویز صاحب کی گراں مایہ تصنیف

سلیم کے نام خطوط

مفسر قرآن کا مخصوص، دل کش، شگفتہ اور آسان عام فہم انداز نگارش

جلد اول - آٹھ روپے   جلد دوم چھ روپے   جلد سوم چھ روپے

ملنے کا پتہ۔ میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ - ۲۷ بی - شاہ عالم مارکیٹ - لاہور

رابطۂ باہمی

یوں تو ہمارے قدامت پرست طبقہ کی طرف سے "قرآنی فکر کی مخالفت" روزِ اول سے شروع تھی ــــــــ اور وہ کونسا دور ہے جس میں خالص دینِ خداوندی پیش کرنے والوں کی مخالفت نہیں ہوتی ــــــــ لیکن پچھلے ماہ یہ مخالفت یہاں تک پہنچ گئی جب اس فکر کے تمام متفقین کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کیا گیا اور اسے پورے ملک میں پھیلا دیا گیا۔ خود اس فتویٰ میں بھی کچھ کم اشتعال انگیزی سے کام نہیں لیا گیا تھا۔ اس کے بعد جب اسے مختلف اخبارات میں اچھالا گیا اور ہر محراب و منبر سے اسے پورے زور و شور سے پھیلایا گیا تو ساری فضا کو آتشکدہ بنا دیا گیا۔

طلوعِ اسلام اپنے متفقین کو پہلے دن سے یہ تاکید کرتا چلا آرہا تھا کہ مخالفین خواہ کتنا ہی اشتعال کیوں نہ دلائیں، صبر و سکون کے دامن کو کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑنا۔ کبھی جذبات کو بے قابو نہ ہونے دینا۔ ان مخالفتوں کا استقبال نہایت خندہ پیشانی سے کرنا۔ ہاتھ کی حرکت تو ایک طرف زبان سے کوئی لفظ بھی ایسا نہ نکلنے پائے جس سے ملک کی فضا مکدر ہو جائے جس سے امن خطرہ میں پڑ جائے۔

جب مذکورہ صدر فتویٰ اور اس کی صداہائے بازگشت سے فضا کو اس قدر مشتعل کیا گیا تو ہمیں اندیشہ ہوا کہ قرآنی فکر کے متفقین کو سخت کڑے امتحان میں ڈال دیا گیا ہے۔ اللہ کی نصرت ان کے شاملِ حال ہو۔ لیکن بزموں کی طرف سے آمدہ اطلاعات نے ہمارے اس خدشہ کو مبدّل بہ سکون کر دیا کہ ہرچند مخالفین نے اشتعال انگیزی میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی، لیکن بزموں کی طرف سے اسی صبر و سکون کا ثبوت دیا گیا جس کی ہم ان سے توقع رکھتے تھے۔ ہم جہاں مختلف بزموں کو ان کی ہوشمندانہ روش پر درخورِ مبارکباد سمجھتے ہیں، وہاں بدرگاہِ ربّ العزت سجدہ ریز ہیں کہ اس نے انہیں اس کی توفیق ارزاں فرمائی کہ انھوں نے اس تمام اشتعال انگیزی کو اس قدر ہمت اور حوصلہ سے برداشت کیا اور کسی وقت بھی دل کے سکون کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اس امر کا احساس ہمارے لئے باعث

صد مسرت ہے۔ آیندہ بھی ہماری طرف سے یہی تاکید ہے کہ مخالفین خواہ کچھ ہی کیوں نہ کریں، ہماری طرف سے کسی قسم کی کوئی حرکت سرزد نہ ہو جس سے فضا میں اشتعال پیدا ہو یا امنِ عامہ میں ذرا سا بھی خلل واقع ہو۔

چونکہ تمام رپورٹوں میں مذکورہ صورتِ حالات سے متعلق ایک ہی نوعیت کا امن پسندانہ اور مخلصانہ عزم نمایاں ہے۔ اس لئے ہم انہیں فرداً فرداً شائع کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ اس کے لئے ہم تمام بزموں سے معذرت خواہ ہیں۔

اس کے علاوہ ان رپورٹوں میں سے رابطہ باہمی کے تحت جو کچھ شائع کیا جانا ضروری ہے وہ سطور ذیل میں پیش خدمت ہے۔

رپورٹیں

لنڈن: بزم کا ماہانہ اجتماع چغتائی صاحب کے دولت کدہ (120-HAWARD WALK, London-N.2.) پر (جہاں بزم کا دفتر بھی ہے) منعقد ہوا۔ یہ اجتماع اجلاس ہائے گذشتہ کے مقابلہ میں سب سے کامیاب رہا۔ شرکائے اجلاس میں سب سے زیادہ حاضری طلباء کی تھی۔ پاکستان سٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر جناب اسلم خاں، اسلامک کلچر سنٹر کے نمایندہ محترم عبدالرشید جالندھری، ونگ کمانڈ وبیگم جمیم خاں محترم وبیگم وحید خاں (جو دونوں بارایٹ لا کر رہے ہیں) نئے شریک احباب میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ اس اجلاس میں پرویز صاحب کی تقریر ـــــ ولی اللہ کون ہے ـــــ بذریعہ ٹیپ سنائی اور حاضرین نے اس کا بیحد اثر قبول کیا۔

۲۔ جشنِ نزولِ قرآن کی تقریب سعید کا انعقاد محترم ایم افضل جہانگیر کے دولتکدہ (16- CHALCOT SQUARE. London- N.W.1) پر ہوا۔ اس مبارک تقریب میں امپیریل کالج کے طلباء و طالبات بھی شریک ہوئے اور عملی زندگی سے متعلق اسلام کے مختلف گوشوں کو سمجھنے کے لئے افہام و تفہیم کا خوشگوار سلسلہ قائم ہوا جس کے بعد تحریک طلوعِ اسلام کا مسلک و مقصد سامنے آیا اور وہ سب اس سے پوری طرح متاثر تھے۔

خاتمہ اجلاس پر بیگم صاحبہ افضل جہانگیر نے انواع و اقسام کے کھانوں سے حاضرین کی تواضع کی۔ اس موقع پر پمفلٹس بھی تقسیم کئے گئے اور مرحوم فیروز علی بھٹی کی وفات پر گہرے رنج و ملال کا اظہار کرتے ہوئے مرحوم کے حق میں دعائے مغفرت کی گئی۔

گلاسگو میں بزم کے قیام کے سلسلے میں وہاں کے احباب سے رابطہ قائم کیا جا رہا ہے۔

پشاور: محترم فیروز علی بھٹی مرحوم کی وفات پر بزم کا ماتمی اجلاس منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں مرحوم بھٹی صاحب اور والدہ مرحومہ نور محمد صاحب نمایندہ بزم چنیوٹ کی تعزیت کے سلسلے میں دو قراردادیں منظور کی گئیں۔ ان قراردادوں میں جہاں بھٹی مرحوم کی وفات کو بزم قرآنی کا ناقابلِ تلافی نقصان قرار دیا گیا وہاں دعائے مغفرت کے ساتھ وابستگانِ مرحومین سے دلی ہمدردی اور تعزیت کی گئی۔

کوئٹہ: نئی صورتِ حال کے پیشِ نظر بزم کا ایک خصوصی اجتماع ہوا جس میں بزم کے قائم مقام نمایندہ جناب حسن عباس رضوی صاحب نے احباب کو ان کے مقام اور ذمہ داریوں سے آگاہ کرتے ہوئے ایک پُراثر خطاب کیا اور انتہائی مدلل طریق سے یہ حقیقت ان کے ذہن نشین کی کہ مملکت کے نئے آئین کی روشنی میں ان کی ذمہ داریوں کے تقاضے کیا ہیں۔

سیالکوٹ: ۳ مارچ کو بزم کا ایک خصوصی اجتماع ہوا جس میں خواجہ محمد انور صاحب نمایندہ بزم منتخب کرلئے گئے۔ اور محمد عبد اللہ صاحب بٹ کو ان کی نیابت کا منصب دیا گیا۔ فیصلہ کیا گیا کہ آیندہ ہر اجلاس میں پرویز صاحب کے خطابات (بذریعہ ٹیپ) سننے کا اہتمام کیا جائے۔ اس اجلاس میں محترم ڈاکٹر ندیم صاحب اور ملک محمد سلیمان صاحب وکیل نے بزم کی رکنیت قبول کی اور نئے احباب کو دائرہ رکنیت میں لانے کا بھی وعدہ فرمایا۔

خاتمہ اجلاس پر محترم خواجہ محمد انور صاحب (نمایندہ بزم) کی طرف سے احباب کے لئے افطاری کا انتظام کیا گیا۔

لائل پور: ۲ مارچ کو بزم کا اجلاس ہوا۔ اس اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعے بھٹی مرحوم کی وفات پر دلی رنج و غم کا اظہار کیا گیا اور پسماندگانِ مرحوم سے ہمدردی اور تعزیت کی گئی۔ ایک دوسری قرارداد میں بزم چنیوٹ کے نمایندہ محترم نور محمد صاحب کی والدہ ماجدہ کی وفات پر اظہارِ الم کرتے ہوئے نمایندہ موصوف سے مخلصانہ تعزیت کا اظہار کیا گیا اور دعائے مغفرت کی گئی۔

احباب نے قرآنی فکر کی اشاعت و تبلیغ کے لئے پیش از پیش جد و جہد سے کام لینے کا متفقہ طور پر عزم کیا۔

بورے والا: احباب نے شمارہ فروری کی کاپیاں اور بہت سا لٹریچر عوام میں تقسیم کیا۔ بزم کا ایک خصوصی اجلاس منعقد ہوا جس میں مسلم دوستوں نے حقیقی مقامات قرآن کریم اور لغات القرآن کی روشنی میں حاضرین

کے سامنے لائے گئے۔

راولپنڈی:- ۱۶ مارچ کو بزم کا اجلاس ہوا جس میں درس قرآنی سے متعلق پرویز صاحب کا خطاب بذریعہ ٹیپ سنایا گیا۔ محترم ڈاکٹر عزیز الحسن صاحب نے "قرآنی تحریک میں ہمارا حصہ" کے موضوع پر ایک پُراثر تقریر فرمائی۔ محترم عزیز قریشی صاحب (نمائندہ بزم) نے قرآنی تحریک کے مقاصد بیان کئے اور واضح کیا کہ یہ تحریک نہ کوئی مذہبی فرقہ ہے اور نہ سیاسی پارٹی۔ اس کا مقصد ہر قسم کے تفرقہ سے بالاتر رہ کر اس مقصود و منتہا کو عام کرنا ہے جو خدا کی آخری کتاب پیش کر رہی ہے۔

بزم کی مجلس عاملہ ایک خصوصی اجلاس میں اس امر کا فیصلہ کرے گی کہ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں مناسب طور پر تقسیم کار سے کام لیا جائے۔ اور سب احباب کو باضابطہ ذمہ داری سونپی جائے اور طلوع اسلام کی خریداری کی مہم کو ترقی دی جائے۔

دیگر کتابوں کے علاوہ مفہوم القرآن (پارہ اول) کی پچاس کاپیاں فروخت کی گئیں اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے بزم نیا ٹیپ ریکارڈر خریدنے کا اہتمام بھی کر رہی ہے۔

مری:- شدت سرما میں کمی واقع ہونے پر بزم کا پہلا اجلاس یہاں منعقد ہوا۔ بھٹی مرحوم کی وفات حسرت آیات پر دلی ملال کا اظہار کرتے ہوئے تعزیتی قرارداد منظور کی گئی۔ اس موقع پر احباب کے دل رنج و غم سے لبریز تھے اور وہ محسوس کر رہے تھے کہ بھٹی صاحب کی موت نے ایک عظیم سرپرست سے محروم کر دیا۔

سب احباب نے مرحوم کے لئے بخلوصِ قلب دعائے مغفرت کی۔

مفہوم القرآن کا سستا ایڈیشن اہلِ علم حضرات میں مفت تقسیم کیا گیا۔

بزموں کی رپورٹ ہر ماہ کی ۵ تاریخ تک لازماً پہنچ جانی چاہیئے۔ ورنہ متعلقہ ماہ کے شمارے میں اس کی اشاعت ممکن نہ ہوگی۔ (ناظم ادارہ)

کراچی کے دوستو! آئندہ اتوار کی صبح کو ۹ بجے سندھ اسمبلی ہال (بندر روڈ) میں مفکر قرآن محترم پرویز صاحب کے الفاظ میں سنیئے کہ قرآن عصر حاضر کے ہر چیلنج کا علیٰ وجہ البصیرت کیا جواب دیتا ہے۔ اور مسائل زندگی کا کس قدر نکھرا ہوا حل پیش کرتا ہے۔

اقبالؒ کا پاکستان

حصولِ پاکستان کے آغاز سے پاکستان کے مستقبل کا مسئلہ زیرِ غور چلا آ رہا ہے۔ پاکستان کا تصور حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی بصیرتِ قرآنی کا نتیجہ تھا۔ اس لئے وہی بتا سکتے تھے کہ اس خاکہ میں کس قسم کا رنگ بھرا جائے گا۔ پاکستان کی انتہائی بدقسمتی ہے کہ وہ اقبالؒ کی قیادت سے محروم رہ گیا۔ اگر آج اقبالؒ زندہ ہوتے تو وہ اپنے تصور کو قرآن کی روشنی میں عملی شکل عطا کر دیتے۔

ہر چند ہم میں آج اقبال موجود نہیں لیکن اقبالؒ کی فکر ہمارے پاس موجود ہے۔ ہم اس فکر کی روشنی میں دیکھ سکتے ہیں کہ ان کے نزدیک پاکستان کی اسلامی مملکت کا نقشہ کیا ہونا چاہیئے تھا۔ ذیل میں ہم فکرِ اقبال کے بکھرے ہوئے موتیوں کو ایک ترتیب سے پیش کرتے ہیں تاکہ یہ ہمارے لئے نشاناتِ راہ کا کام دے سکیں۔ ان میں سے کئی چیزیں اس سے پیشتر قارئین طلوعِ اسلام کے سامنے آ چکی ہیں لیکن یہ چیزیں ایسی ہیں کہ جتنی بار سامنے آئیں، ان کی افادی حیثیت بڑھتی جاتی ہے۔ دیکھئے کہ اقبال کے نزدیک اس نقشہ کے خطوط کیا تھے۔ (ادارہ)

قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں

عرشی صاحب کا بیان ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ علامہ اقبال سے پوچھا کہ "خارج از قرآن ذخیرۂ احادیث و روایات اور کتب فقہ وغیرہ کو شامل کر کے اسلام مکمل ہوتا ہے یا صرف قرآن اس باب میں کفایت کرتا ہے"۔ انھوں نے فرمایا: "یہ چیزیں تاریخ و معاملات پر مشتمل ہیں۔ ان کی بھی ضرورت ہے اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ کن ضروریات کے ماتحت وضع کی گئیں لیکن نفسِ اسلام قرآن مجید میں بکمال و تمام آ چکا ہے۔ خداوند تعالیٰ کا منشاء دریافت کرنے کے لئے ہمیں قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں"۔ (البیان۔ دسمبر ۱۹۲۹ء)

احادیث

احادیث کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کی حیثیت قانونی ہے، اور دوسری وہ جو قانونی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اوّل الذکر کے بارے میں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک ان رسوم و رواج پر مشتمل ہیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھے۔ اور جن میں سے بعض کو رسول اللہ صلعم نے علیٰ حالہٖ رکھا اور بعض میں ترمیم فرما دی۔ آج یہ مشکل ہے کہ ان چیزوں کو پورے پورے طور پر معلوم کیا جا سکے۔ کیونکہ ہمارے متقدمین نے اپنی تصانیف میں زمانہ قبل از اسلام کے رسوم و رواج کا زیادہ ذکر نہیں کیا۔ نہ ہی یہ معلوم کرنا ممکن ہے کہ جن رسوم و رواج کو رسول اللہ صلعم نے علیٰ حالہٖ رکھا (خواہ ان کے لئے واضح طور پر حکم دیا ہو یا ویسے ہی ان کا استصواب فرما دیا ہو) انہیں ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رکھنا مقصود تھا۔ اس موضوع پر شاہ ولی اللہ نے بڑی عمدہ بحث کی ہے جس کا خلاصہ میں یہاں بیان کرتا ہوں۔

شاہ صاحبؒ نے کہا ہے کہ پیغمبرانہ طریق تعلیم یہ ہوتا ہے کہ رسولؐ کے احکام ان لوگوں کے عادات و اطوار اور رسوم و رواج کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں جو اس کے اولین مخاطب ہوتے ہیں۔ پیغمبر کی تعلیم کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ عالمگیر اصول عطا کر دے لیکن نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول دیئے جا سکتے ہیں اور نہ ہی انہیں بغیر کسی اصول کے چھوڑا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مسلک زندگی کے لئے جس قسم کے اصول چاہیں وضع کر لیں۔ لہٰذا پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور پھر انہیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور خمیر استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ لیکن ان اصولوں کا نفاذ اس قوم کے عادات و خصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریق کار کی رو سے رسولؐ کے احکام اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی، انہیں آنے والی نسلوں پر من و عن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ امام اعظم ابو حنیفہؒ نے (جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے) اپنی فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے تدوین فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے وقت اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی فقہ کا مدار احادیث پر کیوں نہیں رکھا۔ ان حالات کی روشنی میں میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے۔ امام ابو حنیفہ کا یہ طرز عمل بالکل معقول اور مناسب تھا۔ اور اگر آج کوئی وسیع النظر مقنن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من و عن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا یہ طرز عمل امام ابو حنیفہؒ کے طرز عمل کے ہم آہنگ ہو گا۔ جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین مقننین میں ہوتا ہے۔

(خطباتِ اقبال ص ۱۶۲-۱۶۳)

احکام قرآنیہ کی ہیئت کو ثابت کیا جائے

مجھ کو انؒ[1] کے خیالات سے کسی حد تک پہلے بھی آگاہی ہے۔ کیا اچھا ہو کہ وہ شریعت محمدیہ پر ایک مبسوط کتاب تحریر فرمائیں جس میں عبادات و معاملات کے

[1] مولانا خواجہ احمد الدین صاحب۔

متعلق صرف قرآن سے استدلال کیا گیا ہو۔ معاملات کے متعلق خاص طور پر اس قسم کی کتاب کی آجکل شدید ضرورت ہے۔ ہندوستان میں تو شاید اس کے مقبول ہونے کے لئے مدت درکار ہے، ہاں دوسرے اسلامی ممالک میں اس کی ضرورت کا احساس ہر روز بڑھ رہا ہے۔ شیخ علی رزاق اور دوسرے علمائے مصر کے مباحث سے مولوی صاحب آگاہ ہوں گے۔ علیٰ ہذا القیاس ترکی میں بھی یہی مسائل زیرِ غور ہیں۔ اس پر ایک آدھ کتاب بھی تصنیف ہو چکی ہے۔ اس میں زیادہ تر زمانہ حال کے مغربی اصولِ فقہ کو ملحوظ رکھ کے فقہ اسلامی پر بحث کی گئی ہے۔ ترکوں نے جو چرچ "اور" سٹیٹ" میں امتیاز کر کے ان کو الگ کر دیا ہے۔ اس کے نتائج نہایت دور رس ہیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ افتراق اقوامِ اسلامی کے لئے باعثِ برکت ہوگا یا شقاوت۔ غرضکہ مولوی صاحب یا ان کے رفقاء کو جو کلامِ الٰہی اور مسلمانوں کے دیگر مذہبی لٹریچر پر عبور رکھتے ہیں اس طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ میں اور مجھ جیسے اور لوگ صرف ایک آنکھ رکھتے ہیں۔ ایک مدت سے ہم یہ سن رہے ہیں کہ قرآن کامل کتاب ہے اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے۔ رسالہ "بلاغ" امرتسر کے ہر نمبر میں اور مولوی حشمت علی صاحب کے رسالہ "اشاعت القرآن" کے ہر نمبر میں اسی پر بحث ہوتی ہے لیکن ضرورت ہے کہ اس کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیادتِ انسانی کے لئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں اور اس میں فلاں فلاں آیات سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے نیز جو جو قواعد عبادات یا معاملات کے متعلق (بالخصوص موخر الذکر کے متعلق) دیگر اقوام میں اس وقت تک مروج ہیں۔ ان پر قرآنی نقطۂ نگاہ سے تنقید کی جائے اور دکھایا جائے کہ وہ بالکل ناقص ہیں اور ان پر عمل کرنے سے نوعِ انسانی کبھی سیادت سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتی۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانہ حال کے "جورس پروڈنس" یعنی اصولِ فقہ پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا۔ وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور بنی نوعِ انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا۔ قریباً تمام ممالک میں اس وقت مسلمان یا تو اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں یا تو آئینِ اسلامیہ پر غور و فکر کر رہے ہیں (سوائے ایران و افغانستان کے) مگر ان ممالک میں بھی امروزِ فردا یہ سوال پیدا ہونے والا ہے مگر افسوس ہے کہ زمانہ حال کے اسلامی فقہا یا تو زمانہ کے میلانِ طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔ ایران میں مجتہدین شیعہ کی تنگ نظری اور قدامت پسندی نے بہاء اللہ کو پیدا کیا جو سرے سے احکامِ قرآنی کا ہی منکر ہے۔ ہندوستان میں عام حنفی اس بات کے قائل ہیں۔ کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں۔ میں نے ایک بہت بڑے عالم کو یہ کہتے سنا کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کا نظیر ناممکن ہے۔ غرضکہ یہ وقت عملی کام کا ہے۔ کیونکہ میری ناقص رائے میں مذہبِ اسلام گویا زمانہ کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے۔ اور شاید تاریخِ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔

(مکتوب بنام صوفی غلام مصطفےٰ تبسم۔ محررہ ۲ ستمبر ۱۹۲۵ء)

مسلمانوں کا نصب العین | الفاظ شرفِ انسانی کے متعلق کسی کو دھوکا نہیں ہونا چاہیئے اسلامیات میں ان سے

مراد وہ حقیقتِ کبریٰ ہے جو حضرتِ انسان کے قلب و ضمیر میں ودیعت کی گئی ہے یعنی یہ کہ اس کی تقویم فطرت اللہ ہے اور اس شرف کا غیر ممنون یعنی غیر منقطع ہونا منحصر ہے اس تڑپ پر جو توحیدِ الٰہی کے لئے اس کے رگ و ریشہ میں مرکوز ہے۔ انسان کی تاریخ پر نظر ڈالو، ایک لامتناہی سلسلہ ہے باہم آویزشوں کا، خونریزیوں کا اور خانہ جنگیوں کا۔ کیا ان حالات میں عالمِ بشری میں ایک ایسی امت قائم ہو سکتی ہے جس کی اجتماعی زندگی امن و سلامتی پر مبنی ہو؟ قرآن کا جواب ہے کہ ہاں ہو سکتی ہے بشرطیکہ توحیدِ الٰہی کو انسانی فکر و عمل میں حسبِ منشاءِ الٰہی مشہود کرنا انسان کا نصب العین قرار پائے۔ ایسے نصب العین کی تلاش اور اس کا قیام سیاسی تدبیر کا کرشمہ نہ سمجھئے بلکہ یہ رحمۃ للعالمین کی ایک شان ہے، کہ اقوامِ بشری کو ان کے تمام خود ساختہ تفوقوں اور فضیلتوں سے پاک کر کے ایک ایسی امت کی تخلیق کی جائے جس کو امتِ مسلمۃ للّٰہ کہہ سکیں اور اس کے فکر و عمل پر شہداءَ علی الناس کا خدائی ارشاد صادق آ سکے۔ (حسین احمد مدنی کے جواب میں۔ متعلقہ قومیت)

اسلام رنگ و نسل و جغرافیہ سے بلند ہو کر انسانیت کو دعوت دیتا ہے

(۱) اسلام ہمیشہ رنگ و نسل کے عقیدہ کا جو انسانیت کے نصب العین کی راہ میں سب سے بڑا سنگِ گراں ہے نہایت کامیاب حریف رہا ہے۔ رینان کا یہ خیال غلط ہے کہ سائنس اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ دراصل اسلام بلکہ کائناتِ انسانیت کا سب سے بڑا دشمن رنگ و نسل کا عقیدہ ہے اور جو لوگ نوعِ انسانی سے محبت رکھتے ہیں ان کا فرض ہے کہ ابلیس کی اس اختراع کے خلاف علمِ جہاد بلند کریں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ قومیت کا عقیدہ جس کی بنیاد نسل یا جغرافیائی حدود و ملک پر ہے۔ دنیائے اسلام میں استیلا حاصل کر رہا ہے۔ اور مسلمان عالمگیر اخوت کے نصب العین کو نظر انداز کر کے اس عقیدہ کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہیں جو قومیت کو ملک و وطن کی حدود میں مقید رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لئے میں ایک مسلمان اور ہمدردِ نوعِ انسانی کی حیثیت سے انہیں یہ یاد دلانا مناسب سمجھتا ہوں کہ ان کا حقیقی فرض سارے بنی آدم کی نشوونما اور ارتقاء ہے۔ نسل اور حدودِ ملک کی بنیاد پر قبائل اور اقوام کی تنظیم حیاتِ اجتماعی کی ترقی اور تربیت کا ایک وقتی اور عارضی پہلو ہے۔ اگر اسے یہی حیثیت دی جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن میں اس چیز کا مخالف ہوں کہ اسے انسانی قوتِ عمل کا منتہائے نظر سمجھ لیا جائے۔

یہ درست ہے کہ مجھے اسلام سے بے حد محبت ہے لیکن مسٹر ڈکنسن کا یہ خیال صحیح نہیں کہ میں نے محض اس محبت کے پیشِ نظر مسلمانوں کو اپنا مخاطب ٹھہرایا ہے۔ بلکہ دراصل عملی حیثیت سے میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ایک خاص جماعت یعنی مسلمانوں کو اپنا مخاطب قرار دیا جائے۔ کیونکہ تنہا یہی جماعت میرے مقاصد کے لئے موزوں واقع ہوئی ہے۔ مسٹر ڈکنسن کا یہ خیال بھی تسامح سے خالی نہیں کہ اسلامی تعلیمات کی روح کسی خاص گروہ سے مختص ہے۔ اسلام تو کائناتِ انسانیت کے اتحادِ عمومی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان کے تمام جزوی اختلافات سے قطع نظر کر لیتا ہے اور کہتا ہے: تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم۔ (ڈاکٹر نکلسن کے نام مکتوب۔ متعلقہ فلسفۂ خودی)

(۲)

اسلام کے مذکورہ بالا دعوے پر عقلی دلائل کے علاوہ تجربہ بھی شاہد ہے۔ اول یہ کہ اگر عالم بشریت کا مقصد اقوام انسانی کا امن، سلامتی اور ان کی موجودہ اجتماعی حیثیتوں کو بدل کر ایک واحد اجتماعی نظام قرار دیا جائے تو سوائے نظام اسلام کے کوئی اور اجتماعی نظام ذہن میں نہیں آ سکتا کیونکہ جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے اس کی رو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ عالم بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے، جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔ تاریخ ادیان اس بات کی شاہد عادل ہے کہ قدیم زمانہ میں "دین" قومی تھا، جیسے مصریوں، یونانیوں اور ہندیوں کا۔ بعد میں نسلی قرار پایا، جیسے یہودیوں کا۔ مسیحیت نے یہ تعلیم دی کہ دین انفرادی اور پرائیویٹ عقائد کا نام ہے۔ اس واسطے انسان کی اجتماعی زندگی کی ضامن صرف اسٹیٹ ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے، نہ نسلی، نہ انفرادی، نہ پرائیویٹ بلکہ خالصتہً انسانی ہے، اور اس کا مقصد باوجود تمام فطری امتیازات کے عالم بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے۔ ایسا دستور العمل قوم اور نسل پر بنا نہیں کیا جا سکتا، نہ اس کو پرائیویٹ کہہ سکتے ہیں بلکہ اس کو صرف معتقدات پر ہی مبنی کیا جا سکتا ہے۔ صرف یہی ایک طریق ہے جس سے عالم انسانی کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یکجہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے جو ایک امت کی تشکیل اور اس کے بقا کے لئے ضروری ہے۔ کیا خوب کہا ہے مولانا رومی نے:

ہم دلی از ہم زبانی بہتر است!

اس سے علیحدہ رہ کر جو اور راہ اختیار کی جائے وہ راہ لادینی کی ہوگی اور شرف انسانیت کے خلاف ہوگی۔ چنانچہ یورپ کا تجربہ دنیا کے سامنے ہے۔ جب یورپ کی دینی وحدت پارہ پارہ ہو گئی۔ اور یورپ کی اقوام علیحدہ علیحدہ ہو گئیں تو ان کو اس بات کی فکر ہوئی کہ قومی زندگی کی اساس کیا قرار پائے۔ ظاہر ہے کہ مسیحیت ایسی اساس نہ بن سکتی تھی۔ انھوں نے یہ اساس وطن کے تصور میں تلاش کی۔ کیا انجام ہوا اور ہو رہا ہے۔ ان کے اساس کے انتخاب کا؟ لوتھر کی اصلاح، غیر سلیم عقلیت کا دور، اصول دین کا اسٹیٹ کے اصولوں سے افتراق بلکہ جنگ، یہ تمام قوتیں یورپ کو دھکیل کر کس طرف لے گئیں۔ لادینی، دہریت اور اقتصادی جنگوں کی طرف!

(حسین احمد مدنی کے جواب میں — مضمون متعلقہ وطنیت)

(۳)

نبوت محمدیہ کی غایت الغایات یہ ہے کہ ہیئت اجتماعیہ انسانیہ قائم کی جائے جس کی تشکیل اس قانون الٰہی کے تابع ہو جو نبوت محمدیہ کو بارگاہ الٰہی سے عطا ہوا تھا۔ بالفاظ دیگر یوں کہیئے کہ بنی نوع انسان کی اقوام کو باوجود شعوب و قبائل اور الوان کے اختلافات کو تسلیم کر لینے کے، ان تمام آلودگیوں سے منزہ کیا جائے جو زمان، مکان، وطن، قوم، نسل، نسب،

ملک وغیرہ کے ناموں سے موسوم کی جاتی ہیں اور اس طرح اس پیکرِ خاکی کو وہ ملکوتی تخیل عطا کیا جائے جو اپنے وقت کے ہر لحظہ میں ابدیت سے ہم کنار رہتا ہے، یہ ہے مقامِ محمدی، یہ ہے نصب العین ملتِ اسلامیہ کا۔ اس کی بلندیوں تک پہنچنے میں معلوم نہیں حضرتِ انسان کو کتنی صدیاں لگیں، مگر اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ اقوامِ عالم کی باہمی مغائرت دور کرنے اور باوجود شعوبی، قبائلی، نسلی، لونی اور لسانی امتیازات کے، ان کو ایک رنگ کرنے میں جو کام اسلام نے تیرہ سو سال میں کیا ہے وہ دیگر ادیان سے تین ہزار سال میں بھی نہیں ہو سکا یقین جانئے کہ دینِ اسلام ایک پوشیدہ اور غیر محسوس حیاتی اور نفسیاتی عمل ہے جو بغیر کسی تبلیغی کوششوں کے بھی عالمِ انسانی کے فکر و عمل کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ایسے عمل کو حال کے سیاسی منکرین کی جدت طرازیوں سے مسخ کرنا ظلمِ عظیم ہے۔ بنی نوعِ انسان پر اور اس نبوت کی ہمہ گیری پر جس کے قلب و ضمیر سے اس کا آغاز ہوا۔ (مولانا حسین احمد مدنی کے جواب میں — مضمون متعلقہ وطنیت)

عالمگیر پیغام کیلئے بھی ایک سوسائٹی کی ضرورت ہوتی ہے

مسٹر ڈکنسن نے آگے چل کر میرے فلسفہ کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ اپنی حیثیت کے اعتبار سے عالمگیر ہے لیکن باعتبارِ اطلاق، وانطباق مخصوص و محدود، ایک حیثیت سے ان کا ارشاد صحیح ہے۔ انسانیت کا نصب العین شعراور فلسفہ میں عالمگیر حیثیت سے پیش کیا گیا ہے لیکن اگر اسے موثر نصب العین بنانا اور عملی زندگی میں بروئے کار لانا چاہیں تو آپ شاعروں اور فلسفیوں کو اپنا مخاطب اولین نہیں ٹھہرائیں گے اور ایسی ایک مخصوص سوسائٹی تک اپنا دائرہ مخاطبت محدود کر دیں گے جو ایک مستقل عقیدہ اور معین راہِ عمل رکھتی ہو لیکن اپنے عملی نمونے اور ترغیب و تبلیغ سے ہمیشہ اپنا دائرہ وسیع کرتی چلی جائے۔ میرے نزدیک اس قسم کی سوسائٹی اسلام ہے۔ (ڈاکٹر نکلسن کے نام مکتوب — متعلقہ فلسفہ سخت کوشی)

میری فارسی نظموں کا مقصود اسلام کی وکالت نہیں بلکہ میری قوتِ طلب و جستجو ایک چیز پر مرکوز رہی ہے کہ ایک جدید معاشرتی نظام تلاش کیا جائے اور عقلاً یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کوشش میں ایک معاشرتی نظام سے قطع نظر کر لیا جائے جس کا مقصد وحید، ذات پات، رتبہ و درجہ، رنگ و نسل کے تمام امتیازات کو مٹا دینا ہے۔ اسلام دنیاوی معاملات کے باب میں نہایت ژرف نگاہ بھی ہے، اور پھر انسان میں بے نفسی اور دنیوی لذائذ و نعم کے ایثار کا جذبہ بھی پیدا کرتا ہے۔ اور حسنِ معاملت کا تقاضا یہی ہے کہ اپنے ہمسایوں کے بارے میں اسی قسم کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ یورپ اس گنج گرانمایہ سے محروم ہے اور یہ متاع اسے ہمارے ہی فیضِ صحبت سے حاصل ہو سکتی ہے۔

(ڈاکٹر نکلسن کے نام مکتوب — متعلقہ سخت کوشی)

مذہب نجی معاملہ نہیں

سوال یہ ہے کہ آج جو مسئلہ ہمارے پیش نظر ہے۔ اس کی صحیح حیثیت کیا ہے۔ کیا واقعی مذہب ایک نجی معاملہ نہیں؟ اور آپ یہ چاہتے ہیں کہ اخلاقی اور سیاسی نصب العین کی حیثیت سے اسلام کا بھی وہی حشر ہو جو مغرب میں مسیحیت کا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اسلام کو بطور ایک اخلاقی تخیل کے تو برقرار رکھیں۔ لیکن اس کے نظام سیاست کی بجائے ان قومی نظامات کو اختیار کر لیں جن میں مذہب کی مداخلت کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ ہندوستان میں یہ سوال اور بھی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ باعتبار آبادی ہم لوگ اقلیت میں ہیں۔ یہ دعویٰ کہ مذہبی ارادت محض انفرادی اور ذاتی واردات ہیں، اہل مغرب کی زبان سے تو تعجب خیز نہیں معلوم ہوتا کیونکہ یورپ کے نزدیک مسیحیت کا تصور ہی یہی تھا۔ کہ وہ ایک مشرب رہبانیت ہے جس نے دنیائے ادبیات سے منہ موڑ کر اپنی تمام تر توجہ عالم روحانیت پر جمائی ہے۔ اس قسم کے عقیدے سے لازماً وہی نتیجہ مرتب ہو سکتا تھا جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واردات مذہب کی حیثیت، جیسا کہ قرآن پاک میں ان کا اظہار ہوا ہے، اس سے قطعاً مختلف ہے۔ یہ محض حیاتی نوع کی واردات نہیں ہے کہ ان کا تعلق محض صاحب ارادت کے اندرون ذات سے ہو لیکن اس کے باہر اس کے گرد و پیش کی معاشرت پر ان کا کوئی اثر نہ پڑے۔ برعکس اس کے یہ وہ انفرادی واردات ہیں جن سے بڑے بڑے اجتماعی نظامات کی تخلیق ہوتی ہے اور جن کے اولین نتیجہ سے ایک ایسے نظام سیادت کی تاسیس ہوئی جس کے اندر قانونی تصورات مضمر تھے اور جن کی اہمیت کو محض اس لئے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی بنیاد وحی و الہام پر ہے۔ لہٰذا اس کا مذہبی نصب العین اس معاشرتی نظام سے جو خود اسی کا پیدا کردہ ہے، الگ نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ اگر آپ نے ایک کو ترک کیا تو بالآخر دوسرے کا ترک بھی لازم آئے گا۔ (خطبۂ صدارت مسلم لیگ ۱۹۳۰ء)

(۲)

یاد رکھنا چاہیئے کہ اسلام کوئی کلیسائی نظام نہیں بلکہ یہ ایک ریاست ہے جس کا اظہار روسو سے بھی کہیں پیشتر ایک ایسے وجود میں ہوا جو عقد اجتماعی کا پابند ہو۔ ریاست اسلامی کا انحصار ایک اخلاقی نصب العین پر ہے جس کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان شجر و حجر کی طرح کسی خاص زمین سے وابستہ نہیں بلکہ وہ ایک روحانی ہستی ہے جو ایک اجتماعی ترکیب میں حصہ لیتا ہے اور اس کے ایک زندہ جزو کی حیثیت سے چند فرائض اور حقوق کا مالک ہے۔ (ایضاً)

اسلام اپنے اصولوں میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا

اسلام ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کے اصول کی حیثیت میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا۔ اور ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کے کسی اور آئین سے کسی قسم کا راضی نامہ یا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں، بلکہ اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ ہر دستور العمل جو غیر اسلام

ہونا معقول و مردود ہے۔ (بجواب حسین احمد مدنی — متعلقہ قومیت)

امتِ مسلمہ جس دینِ فطرت کی حامل ہے۔ اس کا نام دینِ قیم ہے۔ دینِ قیم کے الفاظ میں ایک عجیب و غریب لطیفہ قرآنی مخفی ہے اور وہ یہ کہ صرف دین ہی متقوم ہے اس گروہ کے امورِ معاشی اور مادی کا جو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اس کے نظام کے سپرد کرے۔ بالفاظ دیگر قرآن کی رو سے حقیقی تمدنی یا سیاسی معنوں میں قوم دینِ اسلام ہی سے تقویم پاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن صاف صاف اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ کوئی دستور العمل جو غیر اسلام ہو نامعقول و مردود ہے۔ (ایضاً)

ملائیت، تصوف، ملوکیت

(۱) ملائیت: علماء ہمیشہ اسلام کے لئے ایک قوتِ عظیم کا سرچشمہ رہے ہیں لیکن صدیوں کے مرور کے بعد خاص کر زوالِ بغداد کے زمانے سے وہ بیحد قدامت پرست بن گئے۔ اور آزادیٔ اجتہاد (یعنی قانونی امور میں آزاد رائے قائم کرنا) کی مخالفت کرنے لگے۔ وہابی تحریک جو انیسویں صدی کے مصلحین کے لیے حوصلہ افروز تھی، درحقیقت ایک بغاوت تھی، علماء کے اسی جمود کے خلاف۔ پس انیسویں صدی کے مصلحین اسلام کا پہلا مقصد یہ تھا کہ عقاید کی جدید تفسیر کی جائے اور بڑھتے ہوئے تجربہ کی روشنی میں قانون کی جدید تعبیر کرنے کی آزادی حاصل کی جائے۔

(۲) تصوف: مسلمانوں پر ایک ایسا تصوف مسلط تھا جس نے حقائق سے آنکھیں بند کر لی تھیں، جس نے عوام کی قوتِ عمل کو ضعیف کر دیا تھا اور ان کو ہر قسم کے توہم میں مبتلا کر رکھا تھا۔ تصوف اپنے اس اعلیٰ مرتبے سے، جہاں وہ روحانی تعلیم کی ایک قوت رکھتا تھا، نیچے گر کر عوام کی جہالت اور ضعیف اعتقادی سے فائدہ اٹھانے کا ذریعہ بن گیا تھا۔ اس نے بتدریج اور غیر محسوس طریقہ پر مسلمانوں کی قوتِ ارادی کو کمزور اور اس قدر نرم کر دیا تھا کہ مسلمان اسلامی قانون کی سختی سے بچنے کی کوشش کرنے لگے تھے۔ انیسویں صدی کے مصلحین نے اس قسم کے تصوف کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا اور مسلمانوں کو عصرِ جدید کی روشنی کی طرف دعوت دی۔ یہ نہیں کہ یہ مصلحین مادہ پرست تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان اسلام کی روح سے آشنا ہو جائیں جو مادہ سے گریز کرنے کی بجائے اس کی تسخیر کی کوشش کرتی ہے۔

(۳) ملوکیت: مسلمان سلاطین کی نظر اپنے خاندان کے مفاد پر جمی رہتی تھی اور اپنے اس مفاد کی حفاظت کے لئے اپنے ملک کو بیچنے میں پس و پیش نہیں کرتے تھے۔ سید جمال الدین افغانی کا مقصد خاص یہ تھا کہ مسلمانوں کو دنیائے اسلام کے ان حالات کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا جائے۔

(ختم نبوت — بجواب پنڈت جواہر لال نہرو)

پاکستان کی آزادی مسلمانوں کے جمود کو توڑ ڈالے گی

میں صرف ہندوستان اور اسلام کی فلاح و بہبود کے خیال سے ایک منظم اسلامی ریاست کے قیام کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ اس سے ہندوستان کے اندر توازنِ قوت کی بدولت امن و امان قائم ہو جائے گا اور اسلام کو اس امر کا موقع ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی شہنشاہیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں، اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن، شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف ان کے صحیح معانی کی تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانہ حال کی روح سے بھی قریب تر ہو جائیں گے۔ (ایضاً)

اسلام ایک طرح کی سوشلزم ہے

سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیات کے مذہب کے مخالف ہیں۔ اور اس کو افیون تصور کرتے ہیں۔ لفظ افیون اس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا۔ میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان مروں گا۔ میرے نزدیک تاریخِ انسانی کی مادی تاریخ سراسر غلط ہے۔ روحانیت کا میں قائل ہوں مگر روحانیت کے قرآنی مفہوم کا جس کی تشریح میں نے ان تحریروں میں جابجا کی ہے اور سب سے بڑھ کر اس فارسی مثنوی میں جو عنقریب آپ کو ملے گی۔ جو روحانیت میرے نزدیک مغضوب ہے یعنی افیونی خواص رکھتی ہے، اس کی تردید میں نے جابجا کی ہے۔ باقی رہا سوشلزم، سو اسلام خود ایک قسم کا سوشلزم ہے جس سے مسلمان سوسائٹی نے آج تک بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔ (مکتوب بنام غلام السیدین — محررہ ۱۱ اکتوبر ۱۹۳۶ء)

یہی اسلام کی منزہ شکل ہے

لیگ کو آخر الامر یہ طے کرنا ہوگا کہ وہ ایک رسمی جماعت رہنا چاہتی ہے جو صرف مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ کی نمائندگی کرے یا وہ عوام کی نمائندگی کرنا چاہتی ہے۔ اس وقت تک عوام نے لیگ میں کوئی دلچسپی نہیں لی اور اس کی ان کے پاس وجوہات ہیں۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ کوئی سیاسی جماعت جو مسلمانوں کے متوسط طبقہ کی مرفہ الحالی کا وعدہ نہیں دے سکتی، عوام کے لئے کبھی جاذبِ نگاہ نہیں بن سکے گی۔ (اس وقت حالت یہ ہے کہ) آئینِ جدید (یعنی ۱۹۳۵ء کے آئین) کے مطابق اعلیٰ ملازمتیں امراء کے بیٹوں کے حصے میں آجائیں گی اور نچلی ملازمتیں وزراء کے دوستوں اور رشتہ داروں کے لئے وقف ہو جائیں گی (عوام اور متوسط درجہ کے مسلمانوں کا ان میں کوئی حصہ نہیں ہوگا) یہ تو رہا ملازمتوں کی بابت۔ اسی طرح دیگر معاملات میں بھی ہمارے سیاسی اداروں نے کبھی عوام کی مرفع الحالی کے متعلق کچھ نہیں سوچا۔ روٹی کا مسئلہ دن بدن نازک ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مسلمان محسوس کر رہا ہے کہ وہ گزشتہ دو سو سال سے نیچے ہی نیچے جا رہا ہے۔ اس لئے سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے افلاس کا علاج کیا ہو؟ لیگ کا مستقبل اسی سوال کے حل پر موقوف

ہے۔ اگر لیگ نے اس باب میں یہ نہ کیا تو مجھے یقین ہے کہ عوام اب سے اسی طرح بے تعلق رہیں گے جس طرح اس وقت تک بے تعلق رہے ہیں۔ یہ ہماری خوش فہمی ہے کہ اسلامی آئین کے پاس اس مسئلہ کا حل موجود ہے۔ اس آئین کو دورِ حاضرہ کے تصورات کی روشنی میں مزید نشو ونما (Development) دی جا سکتی ہے۔ اسلامی آئین کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام کو اچھی طرح سے سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو اس سے کم از کم ہر فرد کو سامانِ پرورش (Subsistance) ضرور مل جاتا ہے (ہندوؤں کے پاس اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں) اگر ہندوؤں نے اشتراکی جمہوریت (Social Democracy) کو اپنے ہاں قبول کر لیا تو ہندو مت کا خاتمہ ہو جائے گا لیکن اسلام کے لئے اشتراکی جمہوریت کو ایسے مناسب انداز سے قبول کر لینا جس سے یہ اس کے اصولوں سے ٹکرائے نہیں، اسلام میں کسی تبدیلی کے مرادف نہیں ہوگا بلکہ اس سے مفہوم یہ ہوگا کہ ہم اسلام کو پھر سے منزہ صورت میں اختیار کر رہے ہیں۔ جیسا وہ شروع میں تھا۔

(مکتوب بنام قائد اعظم محمد علی جناح — مورخہ ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء)

راولپنڈی کے احباب

نوٹ فرمالیں کہ ہر جمعہ بوقت چار بجے شام بمقام الکوثر بلڈنگ بالمقابل گورنمنٹ گرلز کالج مری روڈ پر محترم پرویز صاحب کا درس قرآن مجید بذریعہ ٹیپ سنایا جاتا ہے

"بزم طلوعِ اسلام راولپنڈی"

مفت

دوائے برائے دمہ درد گردہ و پتھری

ملنے کا پتہ:- حاجی محمد دین۔ شیخ آئس فیکٹری متصل گینز کھوپڑا ملز۔ لارنس روڈ کراچی

اپنے پتہ کا لفافہ بھیج کر دوا مفت منگالیں

بیادِ اقبال

دُررِ منثور

ان موتیوں میں سے چند موتی جو اقبال کے مکتوبات و دیگر تحریرات نثر میں جا بجا بکھرے پڑے ہیں۔

اسلام تقدیر کا محتاج نہیں۔ وہ بجائے خود تقدیر ہے۔ (خطبہ صدارت ۱۹۳۰ء)

زندگی اپنے ماحول میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔

(دیباچہ پیامِ مشرق)

تاریخ انسانیت میں اسلام کا ظہور ایسے وقت میں ہوا جب کہ توحیدِ انسانیت کے دقیانوسی اصول مثلاً خونی رشتے اور تخت و تاج کے علائق ناکام ہو رہے تھے۔ چنانچہ اسلام کے نزدیک توحیدِ انسانیت کا اصول گوشت پوست سے متعلق نہیں بلکہ اس کا سرچشمہ قلبِ انسانیت میں ہے۔ انسانیت کے نام اسلام کا عمرانی پیغام یہی ہے کہ نسلی امتیازات مٹا دو۔ ورنہ خانہ جنگی میں تباہ ہو جاؤ گے۔ یہ کہنا مبالغہ آمیزی نہیں ہو گا کہ اسلام قدرت کے نسل ساز مظاہر کو پسند نہیں کرتا اور اپنے مخصوص اداروں سے ایسے نقطۂ نگاہ کی تخلیق کرتا ہے جو قدرت کے نسل ساز قویٰ کو بیکار کرے۔ انسانوں کے سدھار کے لئے اسلام نے ایک ہزار سال میں وہ کچھ کر دکھایا جو عیسائیت اور بدھ مت سے دو ہزار سال سے اوپر میں بھی نہیں ہو سکا۔ (احمدیت سے متعلق۔ نہرو کے جواب میں)

اسلام کا مذہبی نصب العین اس معاشری نظام سے ناقابلِ شکست طریق سے وابستہ ہے جو اس نے تشکیل دیا ہے

یہاں تک کہ ایک کا انکار دوسرے کے انکار کو مستلزم ہے۔ لہٰذا قومی خطوط پر کسی ہیئت اجتماعیہ کا قیام اسلامی اصول وحدت کا نقیض ہے۔ کوئی مسلمان اس کا تصور تک نہیں کر سکتا۔ (خطبۂ صدارت ۱۹۳۰ء)

اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ عالم بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے۔ جو اس کے قومی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔ قدیم زمانے میں دین قومی تھا۔ جیسے مصریوں، یونانیوں اور ہندیوں کا۔ بعد میں نسلی قرار پایا۔ جیسے یہودیوں کا۔ مسیحیت نے یہ تعلیم دی کہ دین انفرادی اور پرائیویٹ ہے، یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے نہ نسلی ہے نہ انفرادی ہے اور نہ پرائیویٹ بلکہ خالصتہً انسانی ہے اور اس کا مقصد باوجود تمام فطری امتیازات کے عالم بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے عالم انسانی کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یکجہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے، جو ایک امت کی تشکیل اور اس کی بقا کے لئے ضروری ہے۔

(حسین احمد مدنی کے جواب میں بیان)

اسلام نفس انسانی اور اس کی مرکزی قوتوں کو فنا نہیں کرتا بلکہ ان کے عمل کے لئے حدود معین کرتا ہے۔ ان حدود کے معین کرنے کا نام اصطلاح اسلام میں شریعت یا قانونِ الٰہی ہے۔

(مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط۔ ۱۹۳۶ء)

اقوام و ملل کے عروج و زوال کی داستانوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قوموں کی زندگی کی سوتیں خشک ہونا شروع ہوتی ہیں تو ان کا زوال بجائے خود ان کے شعراء، فلاسفر، پیشوایان سیاستین وغیرہم کو ایک نئی تحریک خیال سے ابھارتا ہے چنانچہ وہ پیغمبرانہ شان سے اٹھتے ہیں اور استدلال کے گورکھ دھندے تیار کر کے حیاتِ ملی کے رذائل و ذمائم کے گیت گاتے ہیں اور انہیں خوش آیند و درخشاں بناتے ہیں۔ یہ پیغمبر غیر شعوری طور پر قنوطیت کو رہبانیت کے نگاہ فریب لباس میں پیش کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اہل قوم کے عملی قویٰ کو مشلول کر دیتے ہیں اور ان کی روحانی توانائی کو یکسر فنا کر دیتے ہیں۔ (بیان متعلقہ احمدیت)

جب کسی کلچر میں علاماتِ زوال نمودار ہونا شروع ہو جاتی ہیں تو اس کی فلسفیانہ بحثیں، اس کے تصورات اور اس کے

واردات روحانی کی شکلیں جامد اور غیر متحرک ہو جاتی ہیں۔ مجوسی کلچر ایسے ہی دور سے گزر رہی تھی کہ اسلام کا ظہور ہوا۔ جہاں تک میں تاریخ کلچر کا مطالعہ کر سکا ہوں۔ اسلام نے مجوسی کلچر کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ قرآن میں بیّن ثبوت اس امر کے ملتے ہیں کہ قرآن کا مقصد یہ تھا کہ وہ نہ صرف فکر کی نئی راہیں کھول دے بلکہ واردات و کیفیاتِ روحانی کی تشکیل نو کرے۔ لیکن ہمارے مجوسی ورثے نے اسلام کی زندگی کی سوتیں خشک کر دیں اور اس کی روح کی نشوونما اور اس کے مقاصد کی تکمیل کے سلسلے کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ (احمدیت سے متعلق۔ اخبار لائٹ کے جواب میں)

اسلام اس وقت زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے۔ اور شاید تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔
(صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کے نام خط۔ ۱۹۲۵ء)

ایک مدت سے ہم یہ سن رہے ہیں کہ قرآن کامل کتاب اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیادتِ انسانی کے لئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں۔
(صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کے نام خط ۱۹۲۵ء)

میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانۂ حال کے جورس پروڈنس (اصولِ فقہ) پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا وہی اسلام کا مجدد ہوگا۔ اور بنی نوعِ انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا۔ (صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کے نام خط۔ ۱۹۲۵ء)

ہندی مسلمانوں کی بڑی بدبختی یہ ہے کہ اس ملک سے عربی زبان کا علم اٹھ گیا ہے۔ اور قرآن کی تفسیر میں محاورہ عرب سے بالکل کام نہیں لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ملک میں قناعت اور توکل کے وہ معانی لئے جاتے ہیں جو عربی زبان میں ہرگز نہیں۔ (سراج الدین پال کے نام خط۔ ۱۹۱۶ء)

اسلام کے لئے اس ملک میں نازک زمانہ آ رہا ہے جن لوگوں کو کچھ احساس ہے ان کا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کے لئے ہر ممکن کوشش اس ملک میں کریں۔ علماء میں مداہنت آگئی ہے۔ یہ گروہ حق کہنے سے ڈرتا ہے۔ صوفیا اسلام سے بے پرواہ اور حکام کے تصرف میں ہیں۔ اخبار نویس اور آجکل کے تعلیم یافتہ لیڈر خود غرض ہیں اور ذاتی منفعت و عزت کے سوا کوئی

مقصد ان کی زندگی کا نہیں۔ عوام میں جذبہ موجود ہے مگر ان کا کوئی بے غرض رہنما نہیں۔

(چودھری نیاز علی خاں کے نام خط۔ ۱۹۳۷ء)

مسلمانوں پر اس وقت (دماغی اعتبار سے) وہی زمانہ آرہا ہے جس کی ابتدا یورپ کی تاریخ میں لوتھر کے عہد سے ہوئی مگر چونکہ اسلامی تحریک کی کوئی خاص شخصیت راہ نما نہیں ہے اس واسطے اس تحریک کا مستقبل خطرات سے خالی نہیں۔ نہ عامۃ المسلمین کو یہ معلوم ہے کہ اصلاح لوتھر نے مسیحیت کے لئے کیا نتائج پیدا کئے ہیں۔ (سید سلیمان ندوی کے نام خط ۱۹۲۶ء)

میرے دل میں ممالک اسلامیہ کے موجودہ حالات دیکھکر بے اختیار اضطراب پیدا ہو رہا ہے۔ یہ بے چینی اور اضطراب محض اس وجہ سے ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل گھبرا کر کوئی اور راہ اختیار نہ کرے۔ (سید سلیمان ندوی کے نام خط ۱۹۲۶ء)

قومیں فکر سے محروم ہو کر تباہ ہو جاتی ہیں۔ (خطبۂ صدارت ۱۹۳۲ء)

پیشہ ہندوستان کا آخری مسلمان سپاہی تھا جس کو ہندوستان کے مسلمانوں نے جلد فراموش کر دینے میں بڑی ناانصافی سے کام لیا ہے۔ جنوبی ہندوستان میں جیسا کہ میں نے خود مشاہدہ کیا ہے اس عالی مرتبت مسلمان سپاہی کی قبر زندگی رکھتی ہے بہ نسبت ہم جیسے لوگوں کے جو بظاہر زندہ ہیں یا اپنے آپ کو زندہ ظاہر کر کے لوگوں کو دھوکہ دیتے رہتے ہیں۔

(میجر سعید محمد خاں کے نام خط ۔۔۔ اس خط پر تاریخ درج نہیں)

اس وقت (ہندوستان کے مسلمان دو امراض میں مبتلا ہیں۔ پہلا مرض ان قائدین کا فقدان ہے، جو اسلام کی روح اور تقدیر کو بھی بخوبی سمجھتے ہوں۔ اور تاریخ جدید کے میلانات پر بھی ان کی نگاہ ہو۔ ایسے اشخاص ہی قوموں کی قوت متحرکہ ہوتے ہیں لیکن وہ خدا کی دین ہوتے ہیں اور ضرورت کے مطابق پیدا نہیں کئے جا سکتے۔ دوسرا مرض احساس اجتماعیت کا فقدان ہے۔ اس سے افراد اور گروہ اپنی جداگانہ راہیں تلاش کر رہے ہیں اور عمومی فکر اور اجتماعی حرکت میں کوئی اضافہ نہیں کر رہے۔ اس وقت ہم سیاست میں وہ کچھ کر رہے ہیں جو مذہب میں صدیوں سے کرتے چلے آرہے ہیں۔ مذہبی تفرقہ بازی قومی وحدت کو زیادہ نقصان نہیں پہنچاتی کیونکہ مذہبی فرقے اس حد تک باغی نہیں ہو جاتے کہ اسلام سے ہی منحرف ہو جائیں۔ لیکن سیاسی انتشار بالخصوص ایسے نازک وقت میں کہ ملت کا اجتماعی مفاد اتحاد عمل کا متقاضی ہو

مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔ (خطبۂ صدارت۔ ۱۹۳۰ء)

انسان کی بقا کا راز انسانیت کے احترام میں ہے۔ (ریڈیائی تقریر ۱۹۳۸ء)

قومی وحدت ہرگز قائم و دائم نہیں ہے۔ وحدت صرف ایک معتبر ہے اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے، جو نسل، زبان، رنگ اور قومیت سے بالاتر ہے۔ (خطبۂ صدارت ۱۹۳۰ء)

اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالکِ مشرق میں ہر ایسی کوشش جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافیائی حدود سے بالاتر کر کے ان میں ایک صحیح اور قومی انسانی سیرت کی تجدید و تولید ہو قابلِ احترام ہے۔ (دیباچہ پیامِ مشرق)

جو قوم دوسری اقوام سے متعلق جذبات نفرت رکھتی ہے ذلیل اور رذیل ہے۔ (خطبۂ صدارت ۱۹۳۰ء)

میں یورپی تصور کی وطنیت کا مخالف ہوں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس سے مسلمانوں کو کم تر مادی فوائد حاصل ہوں گے۔ بلکہ اس لئے کہ اس میں منکرِ خدا مادیت کے جراثیم پائے جاتے ہیں، جسے میں جدید انسانیت کے لئے عظیم ترین خطرہ سمجھتا ہوں۔

(خطبۂ صدارت ۱۹۳۲ء)

مسلم لیگ کو آخر کار یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ بدستور سابق مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ کی نمائندگی تک ہی محدود رہے گی یا مسلمان عوام کی نمائندگی بھی کرے گی۔ ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ جو سیاسی جماعت عام مسلمانوں کا درجہ بلند کرنے کی داعی نہیں وہ عوام میں کبھی مقبول نہیں ہو سکتی۔ (قائداعظمؒ کے نام خط۔ ۱۹۳۷ء)

آئین کے مطابق اعلیٰ عہدے امراء کی اولاد کے لئے وقف ہیں۔ اور نچلے درجے کے عہدے وزیروں کے دوستوں اور رشتہ داروں کا حصہ ہیں۔ دیگر امور میں ہمارے سیاسی اداروں نے عامۃ المسلمین کا عمومی درجہ بلند کرنے کا کبھی خیال تک نہیں کیا۔ پیٹ کا مسئلہ دن بدن لاینحل ہوتا جا رہا ہے۔ مسلمانوں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا ہے کہ وہ دو سو سال سے ذلیل سے ذلیل تر ہوتا جا رہا ہے۔ سوال یہ ہے مسلمان کے افلاس کا مسئلہ کیسے حل کیا جائے۔ لیگ کا سارا مستقبل اس مسئلہ کے حل پر منحصر ہے۔ اگر لیگ

اس مسئلہ کے حل سے قاصر رہی تو مجھے یقین ہے کہ عوام اس سے دور رہیں گے۔ خوش قسمتی سے اس کا حل اسلامی آئین کی تنفیذ میں ہے۔ طویل غور و فکر کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس طرزِ آئین کو کماحقہٗ سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو کم از کم ہر ایک کا حقِ معیشت تو محفوظ ہو جاتا ہے۔ موجودہ زمانے کے پیدا کردہ مسائل کا حل ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کے لئے زیادہ آسان ہے۔ (قائدِاعظم کے نام خط۔ ۱۹۳۷ء)

جن نام نہاد مدبرین کو انسانوں کی قیادت اور حکومت سونپی گئی تھی۔ وہ خونریزی، سفاکی اور زیردست آزاری کے دیوتا ثابت ہوئے جن حاکموں کا یہ فرض تھا کہ اخلاقِ انسانی کے نوامیس عالیہ کی حفاظت کریں، انسان کو انسان پر ظلم کرنے سے روکیں اور انسانیت کی ذہنی اور عملی سطح کو بلند کریں۔ انھوں نے ملوکیت و استعمار کے جوش میں لاکھوں کروڑوں مظلوم بندگانِ خدا کو ہلاک و پامال کر ڈالا۔ صرف اس لئے کہ ان کے اپنے مخصوص گروہ کی ہوا و ہوس کی تسکین کا سامان بہم پہنچایا جائے۔ (ریڈیو تقریر ۱۹۳۸ء)

اس زمانہ میں ملوکیت کے جبر و استبداد نے جمہوریت، اشتراکیت، فسطائیت اور نہ جانے اور کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں۔ اور ان نقابوں کے نیچے دنیا بھر کے تمام گوشوں میں قدرِ حریت اور شرفِ انسانیت کی وہ مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔ (ریڈیو تقریر ۱۹۳۸ء)

جب تک اقوام کی خودی قانونِ الٰہی کی پابند نہ ہو۔ امن عالم کی کوئی سبیل نہیں نکل سکتی۔

(مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط ۱۹۳۷ء)

انحطاط کا سب سے بڑا جادو یہ ہے کہ یہ اپنے صید پر ایسا اثر ڈالتا ہے جس سے انحطاط کا مسحور اپنے قاتل کو اپنا مربی تصور کرنے لگ جاتا ہے۔ یہی حال اس وقت مسلمانوں کا ہے۔ (سراج الدین پال کے نام خط ۱۹۱۶ء)

ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر میں ہیں۔ ان کو عربی اسلام سے اور اس کے نصب العین اور غرض و غایت سے آشنائی نہیں۔ ان کے لٹریری آئیڈیل بھی ایرانی ہیں اور سوشل نصب العین بھی ایرانی ہیں۔ چاہتا ہوں کہ اس مثنوی میں حقیقی اسلام کو بے نقاب کروں جس کی اشاعت رسول اللہ صلعم سے ہوئی۔ (منشی سراج کے نام خط ۱۹۱۶ء)

ایران کا آبائی اور طبعی مذاق اچھی طرح سے ظاہر ہوا۔ بالفاظ دیگر مسلمانوں میں ایک ایسے لٹریچر کی بنیاد پڑی جس کی بنا وحدت الوجود تھی۔ شعرائے عجم نے نہایت عجیب وغریب اور بظاہر دلفریب طریقوں سے شعائرِ اسلام کی تردید و تنسیخ کی اور اسلام کی ہر محمود شے کو ایک طرح سے مذموم بیان کیا ہے۔ (سراج الدین پال کے نام خط۔ سنہ ۱۹۱۶ء)

تصوف کی تمام شاعری مسلمانوں کے پولیٹیکل انحطاط کے زمانے میں پیدا ہوئی اور ہونا بھی یہی چاہیئے تھا۔ جس قوم میں توانائی مفقود ہو جائے جیسا کہ تاتاری یورش کے بعد مسلمانوں میں مفقود ہو گئی تو قوم کا نقطۂ نگاہ بدل جایا کرتا ہے۔ ان کے نزدیک ناتوانی ایک حسین وجمیل شے ہو جاتی ہے اور ترکِ دنیا موجبِ تسکین۔ اس ترکِ دنیا کے پردے میں قومیں اپنی سستی و کاہلی اور اس شکست کو جو ان کو تنازع البقا میں ہو، چھپایا کرتی ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھئے کہ ان کے ادبیات کا انتہائی کمال لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر ختم ہوا۔ (سراج الدین پال کے نام خط۔ سنہ ۱۹۱۶ء)

تصوف کا وجود سرزمین اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے جس نے عجمیوں کی دماغی آب وہوا میں پرورش پائی۔

(سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ سنہ ۱۹۱۷ء)

جب تصوف فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے اور عجمی اثرات کی وجہ سے نظامِ عالم کے حقائق اور باری تعالیٰ کی ذات کے متعلق موشگافیاں کر کے کشفی نظریہ پیش کرتا ہے تو میری روح اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔

(علامہ اسلم جیراجپوری کے نام خط۔ سنہ ۱۹۱۹ء)

ہندی اور ایرانی صوفیا میں سے اکثر نے مسئلہ فنا کی تفسیر فلسفۂ وحدانیت اور بدھ مت کے زیرِ اثر کی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اس وقت عملی اعتبار سے ناکارہ محض ہے۔ میرے عقیدے کی رو سے یہ تفسیر بغداد کی تباہی سے بھی زیادہ خطرناک تھی۔ اور ایک معنی میں میری تمام تحریریں اسی تفسیر کے خلاف ایک قسم کی بغاوت ہے۔

(مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط۔ سنہ ۱۹۳۶ء)

جب انسان میں خوئے غلامی راسخ ہو جاتی ہے تو ہر ایسی تعلیم سے بیزاری کے بہانے تلاش کرتا ہے جس کا مقصد قوتِ نفس اور روحِ انسانی کا ترفع ہو۔ (مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط۔ سنہ ۱۹۳۶ء)

اگرچہ یورپ نے مجھے بدعت کا چسکا ڈال دیا ہے۔ تاہم مسلک میرا وہی ہے جو قرآن کا ہے۔

(سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ ۱۹۲۲ء)

میرے زیرِ نظر حقائق اخلاقی دلی ہیں۔ زبان میرے لئے ثانوی حیثیت رکھتی ہے، بلکہ فنِ شعر سے بھی بحیثیت فن کے نابلد ہوں۔ (پروفیسر شجاع کے نام خط ۱۹۳۲ء)

شاہین کی تشبیہ محض شاعرانہ تشبیہ نہیں۔ اس جانور میں اسلامی فقر کے تمام خصوصیات پائے جاتے ہیں (۱) خوددار اور غیرت مند ہے کہ اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا۔ (۲) بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا۔ (۳) بلند پرواز ہے۔ (۴) خلوت پسند ہے۔ (۵) تیز نگاہ ہے۔ (مولوی ظفر احمد صاحب کے نام خط۔ ۱۹۳۲ء)

شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کبھی میرا مطمحِ نظر نہیں رہا۔ مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس۔ اس بات کو مدنظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کیا عجب کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں۔ (سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ ۱۹۱۹ء)

میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔ اس واسطے میرا کوئی رقیب نہیں۔ اور نہ میں کسی کو اپنا رقیب تصور کرتا ہوں۔ فن شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ ہاں بعض مقاصد خاص رکھتا ہوں جن کے بیان کے لئے ملک کے حالات و روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کر لیا ہے ورنہ ؎

نہ بینی خیر ازاں مردِ فرودست — کہ بر من تہمتِ شعر و سخن بست

(سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ ۱۹۳۵ء)

اسلام بلکہ کائنات انسانیت کا سب سے بڑا دشمن رنگ و نسل کا عقیدہ ہے۔ اور جو لوگ نوعِ انسانی سے محبت رکھتے ہیں ان کا فرض ہے کہ ابلیس کی اس اختراع کے خلاف علمِ جہاد بلند کریں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ قومیت کا عقیدہ جس کی بنیاد نسل یا جغرافیائی حدود و ملک پر ہے دنیائے اسلام میں استیلا حاصل کر رہا ہے اور مسلمان عالمگیر اخوت کے نصب العین کو نظر انداز کر کے اس عقیدہ کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہیں جو قومیت کو ملک و وطن کی حدود میں مقید کرنے

(باقی مضمون صفحہ پر ملاحظہ ہو)

کافرگری

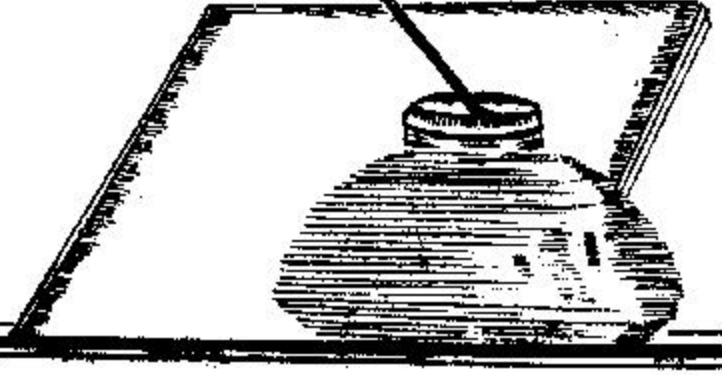

مسلمانوں کے دورِ انحطاط میں جہاں اور بہت سے فتنے پیدا ہوئے ہیں وہاں ایک بڑا اور خطرناک فتنہ ایک دوسرے کو کافر اور فاسق ٹھیرانے اور ایک دوسرے پر لعنت کرنے کا بھی ہے۔ لوگوں نے اسلام کے سیدھے سادے عقائد میں موشگافیاں کیں اور قیاس و تاویل سے اُن کے اندر بہت سے ایسے فروع اور جزئیات پیدا کر لئے جو ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد تھے اور جن کی کوئی تصریح کتاب و سنت میں نہ تھی' یا اگر تھی بھی تو اللہ اور اس کے رسولؐ نے ان کو کوئی اہمیت نہ دی تھی۔ پھر ان اللہ کے بندوں نے (اللہ انہیں معاف فرمائے) اپنے وضع کردہ فروعی مسائل کے ساتھ اتنا اہتمام کیا کہ انہی پر ایمان کا مدار ٹھیرا دیا اور ان کی بنیاد پر اسلام کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا' بیسیوں فرقے بنا دیئے۔ اور ہر فرقے نے ایک دوسرے کو کافر، فاسق، گمراہ، دوزخی اور خدا جانے کیا کیا کہہ ڈالا۔ حالانکہ کفر و اسلام کے درمیان اللہ تعالیٰ نے کتاب مبین میں ایک واضح خط امتیاز کھینچ دیا تھا۔ اور کسی کو یہ حق نہ دیا تھا کہ اپنے اختیار سے جس چیز کو چاہے کفر اور جسے چاہے اسلام ٹھیرا لے۔ اس فتنے کی محرک خواہ تنگ نظری ہو نیک نیتی کے ساتھ، یا خود غرضی اور حسد اور نفسانیت ہو بدنیتی کے ساتھ۔ بہرحال اس نے مسلمانوں کی جماعت کو جتنا نقصان پہنچایا ہے۔ شاید کسی اور چیز نے نہیں پہنچایا۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی

(تفہیمات حصہ دوم فتنہ تکفیر صفحہ ۱۴۱)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کافر گری

کسے نماند کہ دیگر بہ تیغِ ناز کُشی
مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کُشی

اگر ہم کسی کو ایک فقرہ میں بتانا چاہیں کہ نبی اکرمؐ نے اپنی حیاتِ طیبہ میں کیا عظیم کام سرانجام دیا تھا، تو بلا تأمل کہا جا سکتا ہے کہ حضورؐ نے غیر مسلموں کو حلقہ بگوشِ اسلام بنا کر دین کا نظام قائم کیا تھا۔ غیر مسلموں کو مسلمان بنانا کس قدر مشکل کام تھا، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ حضورؐ کی نبوت کی عمر تیئیس (۲۳) سال کی تھی۔ اور چونکہ حضورؐ خدا کے آخری نبی تھے اس لئے یہ تیئیس (۲۳) سال کا عرصہ قیامت تک پھیلا ہوا تھا۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کا ایک ایک لمحہ ہزاروں سال پر بھاری تھا۔ اس عظیم القدر، اہم اور قیمتی، مبارک زندگی کا

کافروں کو مسلمان بنانا

پچاس فیصد سے زیادہ حصہ (تیئیس (۲۳) میں سے تیرہ (۱۳) سال)، مکہ میں بسر ہوا۔ وہاں آپ کو جس قدر مصیبتوں اور تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا، وہ سب پر عیاں ہیں۔ اس قدر طول طویل عرصہ، اور ایسی جانکاہ مشقتوں اور مصیبتوں کا ماحصل کیا تھا؟ تین سو کے قریب افراد کا حلقۂ اسلام میں داخل ہونا۔ اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ ایک غیر مسلم کو مسلمانوں کی جماعت میں داخل کرنے کے لئے حضورؐ کو کتنا وقت صرف کرنا، اور کس قدر جانکاہ اور صبر آزما مراحل میں سے گذرنا پڑتا تھا۔ اس کے بعد، حضورؐ کی مدنی زندگی کا دور شروع ہوا۔ اس میں مسلمانوں کی اس مٹھی بھر جماعت کو، دشمنوں کے حملوں سے بچانے اور اس طرح اس متاعِ گراں بہا کو محفوظ رکھنے کے لئے حضورؐ (اور آپ کے ہمراہ قدوسیوں کی اس جماعت) کو کتنی لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ اور جان و مال کی کس قدر

قربانیاں دینی پڑیں - اس طرح، محمد رسول اللہ والذین معہٗ نے ایک ایک قطرہ اکٹھا کر کے اُمتِ مسلمہ کی جوئے رواں کو مشکل فرمایا، جس نے اپنے ایمانِ محکم اور عملِ پیہم سے، تھوڑے سے عرصہ میں، ایک بحرِ ذخار کی شکل اختیار کر لی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم ورضوا عنہ۔

اس کے بعد، جب خلافت کا شیرازہ منتشر ہو گیا تو دین میں ثنویت (DUALISM) پیدا ہو گئی، یعنی سیاست دین سے الگ ہو گئی۔ اس سے ایک طرف، ملوکیت وجود میں آ گئی اور دوسری طرف مذہبی پیشوائیت (PRIEST - HOOD)۔ حالانکہ دین، ان دونوں کو مٹانے کے لئے آیا تھا، اور اس نے انہیں مٹا کر دکھایا تھا۔

ملوکیت نے اسلام کے ساتھ کیا کیا، اسے اس وقت چھوڑیئے۔ مذہبی پیشوائیت نے جو کچھ کیا اسے دو فقروں میں یوں سمجھئے کہ اس نے پہلے اس اُمتِ واحدہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ اسے فرقوں میں تقسیم کر دیا۔ اور پھر ایک ایک مسلمان کو کافر قرار دے کر دائرۂ اسلام سے خارج کر دیا۔ چنانچہ آپ یہ معلوم کر کے حیران ہوں گے کہ اس وقت (مثلاً) پاکستان میں جس قدر مسلمان بستے ہیں، ان حضرات کے فتووں کے مطابق، ان میں سے ایک بھی مسلمان نہیں۔ یہ مبالغہ نہیں، جیسا کہ ہم ذرا آگے چل کر بیان کریں گے، حقیقت ہے۔ یعنی نبی اکرمؐ اور صحابہؓ کبارؓ نے، ہزار مصیبتیں جھیل کر، ایک ایک غیر مسلم کو حلقہ بگوشِ اسلام بنایا تھا، اور انہوں نے، حلقہ بگوشانِ اسلام کو ایک ایک کر کے کافر بنا دیا۔

مسلمانوں کو کافر بنانا

امتِ مسلمہ کی خصوصیات

نبی اکرمؐ نے جو امت تیار کی تھی، اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا (۳/۱۰۳)

تم خدا کی اس نعمت کو یاد کرو (جس سے اس نے تمہیں نوازا ہے) تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اس نے تمہارے دلوں میں ایک دوسرے کی الفت پیدا کر دی اور اپنی عنایات سے تمہیں بھائی بھائی بنا دیا۔

ایسے بھائی بھائی جن کے متعلق کہا کہ وہ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ (۴۸/۲۹) ہیں۔ یعنی دشمنوں کے مقابلہ میں چٹان کی مانند سخت۔ اور آپس میں نہایت ہمدرد۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ایک دوسرے کا بھائی اور نہایت ہمدرد، غمخوار اور غم گسار بھائی بنایا تھا لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت نے ان بھائیوں کو، اس طرح ایک سے دوسرے کو جدا کیا، اور آپس میں دشمن بنایا کہ وہ

ایک دوسرے کا گلا کاٹنے لگ گئے۔ قرآن کریم نے نہایت واضح الفاظ میں کہا تھا کہ یاد رکھو:

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ۝ (۴/۹۳)

جو جان بوجھ کر کسی مؤمن کو قتل کرے تو اس کی سزا جہنم ہے۔ وہ اس میں رہے گا۔ اس پر اللہ کا غضب اور لعنت ہوگی۔ اور اس کے لئے خدا سخت عذاب تیار کرے گا۔

اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا تھا اور ہماری مذہبی پیشوائیت نے یہ وطیرہ اختیار کیا کہ

(۱) پہلے اُمت کو فرقوں میں بانٹا۔ پھر

(۲) ایک فرقہ نے دوسرے فرقے کو مرتد اور کافر قرار دیا۔ اور

(۳) یہ فتویٰ دیا کہ ان مرتدوں کی سزا قتل ہے۔

اس طرح سر بازار مسلمانوں کی گردنیں خود مسلمانوں کے ہاتھوں سے اُڑنے لگیں۔ اگر آپ تاریخ اسلام کو دیکھیں

مسلمانوں کا خون

تو آپ کو نظر آجائے گا کہ اس ہزار بارہ سو سال کے عرصہ میں کفار کے ہاتھوں اتنے مسلمان شہید نہیں ہوئے، جتنے خود دوسرے مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوئے ہیں ـــــ اور آپ کو معلوم ہے کہ کس قسم کی باتوں پر ایک دوسرے کے قتل کے فتوے دیئے جاتے تھے؟ مثلاً اگر کسی نے کہہ دیا کہ قرآن مخلوق ہے تو اسے کافر قرار دیدیا گیا اور قتل کر دیا۔ دوسرے نے کہہ دیا کہ نہیں قرآن قدیم ہے، تو اسے کافر قرار دے کر قتل کر دیا۔ اگر کسی نے کہہ دیا کہ میں نے اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھا ہے تو اسے کافر قرار دے دیا۔ کسی نے کہہ دیا کہ دستر واجب ہیں تو اسے کافر قرار دے دیا۔ غرضیکہ ذرا ذرا سے اختلاف پر ایک دوسرے کو کافر بناتے اور اس کے قتل کے فتوے صادر کرتے رہے۔ بڑے بڑے جلیل القدر ائمہؒ مفسرینؒ۔ محدثینؒ۔ علماءؒ۔ فقہاءؒ وغیرہ ان کے فتووں کا نشانہ بنائے گئے۔ کسی کو قتل کیا۔ کسی کی زندہ کھال کھنچوائی گئی۔ کسی کو جیل خانے بھجوایا۔ کسی کو کوڑوں سے پٹوایا۔ کسی کا گھر پھونکا گیا۔ کسی کی کتابیں جلائی گئیں۔ کسی کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہ ہونے دیا گیا۔ کسی کی لاش کو پامال کیا گیا۔ کسی کی قبر پر گدھوں کے ہل چلوائے گئے۔ کسی کی تشہیر کی گئی۔ کسی کو ذلیل کیا گیا۔ غرضیکہ ان کے ہاتھوں نہ کسی کی جان محفوظ رہی نہ مال۔ نہ عزت مصئون رہی نہ آبرو۔ اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ دنیا کہیں سے کہیں چلی گئی ہے اور ہم ابھی تک ایک دوسرے کو کافر قرار دینے کے "جہاد عظیم" میں مصروف ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری حالت پر رحم کرے۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ (مثلاً) اس وقت پاکستان میں جس قدر مسلمان ہیں، ان حضرات کے فتووں کے

مطابق ان میں سے کوئی بھی مسلمان نہیں۔ قبل اس کے کہ ہم اس حقیقت کی وضاحت کریں، یہ بتا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ (جیسا کہ قارئین طلوع اسلام کو اچھی طرح معلوم ہے) ہم کسی فرقے سے متعلق نہیں ہیں۔ نہ ہی ہم نے کوئی نیا فرقہ بنایا ہے۔

فرقہ بندی

فرقہ سازی کے متعلق، قرآن کریم نے کہا تھا کہ

وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا ۚ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ۝ (۳۰/۳۲)

(مسلمانو!) دیکھنا۔ تم نے ایمان لانے کے بعد پھر سے) مشرکوں میں سے نہ ہو جانا یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے دین میں فرقے پیدا کر دیئے اور خود بھی ایک گروہ بن بیٹھے پھر حالت یہ ہو گئی کہ ہر گروہ اپنے اپنے طریقے میں مگن ہے۔

اس لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ۚ (۶/۱۶۰)

اے رسول! جن لوگوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے اور گروہ بن بیٹھے۔ تیرا ان سے کوئی تعلق نہیں۔

نبی اکرمؐ کے زمانے میں مسلمانوں میں کوئی فرقہ نہیں تھا۔ سب مسلمان تھے ــــ ہمارا بھی کسی فرقے سے تعلق نہیں ــــ نہ کسی قدیم فرقہ سے، نہ جدید سے۔ نہ ہی ہمارا اپنا کوئی الگ فرقہ ہے۔ ہم صرف مسلمان ہیں اور ان تمام باتوں پر ایمان رکھتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کے مسلمان ہونے کے لئے ضروری قرار دیا ہے ــــ یعنی اللہ پر ایمان۔ انبیائے کرامؑ پر ایمان۔ کتابوں پر ایمان۔ ملائکہ پر ایمان۔ آخرت پر ایمان۔ اس لئے ہم اگر ذیل میں کچھ مثالیں پیش کریں گے جن میں بتایا جائے گا کہ ہمارے "علمائے کرام" کے فتووں کی رو سے، کوئی شخص بھی مسلمان نہیں رہتا، تو اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہم کسی خاص فرقے کی تائید یا تردید کرتے ہیں۔ ہم صرف مثالیں پیش کرتے ہیں، اور وہ بھی دل پر پتھر رکھ کر۔ اس لئے کہ ہمارے نزدیک مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنا اسلام کی رُو سے سب سے بڑا جرم ہے۔ لہٰذا ہمیں ان حضرات کی کفر سازی کی داستانیں دُہرا کر کوئی خوشی نہیں ہوتی۔

اس وقت پاکستان میں جو بڑے بڑے فرقے بستے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) شیعہ اور اہلسنت والجماعت۔

(۲) اہل سنت والجماعت، پھر دو بڑے بڑے فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ غیر مقلد (جنہیں عام طور پر اہلحدیث کہا جاتا ہے) اور مقلد (جنہیں عام طور پر حنفی کہا جاتا ہے)۔

(۲) مقلد پھر دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ دیوبندی۔ اور بریلوی۔ اب دیکھئے کہ یہ فرقے کس طرح آپس میں ایک دوسرے کو کافر قرار دیتے ہیں[1]۔

اہلِ سنّت کی طرف سے شیعہ پر کفر کا فتویٰ

فرقہ امامیہ منکر خلافت حضرت صدیقؓ اند در کتب فقہ مذکور است کہ ہر کہ انکار خلافت حضرت صدیقؓ نماید منکر اجماع قطع گشتہ و کافر شد۔ پس در حق شاں حکمِ کافر جاری است و رافضی واجب القتل است۔

(ترجمہ) اس میں شبہ نہیں کہ فرقہ امامیہ (شیعہ) صدیق اکبرؓ کی خلافت کے منکر ہیں۔ اور کتب فقہ میں لکھا ہے کہ جو، حضرت صدیق اکبرؓ کی خلافت کا انکار کرے وہ اجماع کا منکر اور کافر ہو جاتا ہے اس سے کفار کی طرح ہی معاملہ کرنا چاہیئے۔ رافضی واجب القتل ہیں۔

(رد تبرا صفحہ ۳۰۔ فتاویٰ عزیزی شاہ عبدالعزیزؒ صاحب دہلوی صفحہ ۱۹۳ - ۱۹۱)۔

پھر شیعوں اور سنیوں کے درمیان رشتہ ناطہ کے متعلق فرماتے ہیں۔

در مذہب حنفی موافق روایات مفتی بہ حکم فرقہ شیعہ حکم مرتدان است۔ چنانچہ در فتاویٰ عالمگیری مرقوم است۔ پس نکاح کردن از زن کہ دریں فرقہ باشد درست نیست۔ و در مذہب شافعی دو قول است۔ بر یک قول کافر اند و قولِ دگر فاسق۔

یعنی شیعہ فرقہ کی عورت سے نکاح کرنا جائز نہیں۔ مذہب شافعی میں شیعوں کے متعلق دو قول ہیں۔ ایک قول کے مطابق وہ کافر ہیں۔ دوسرے قول کے مطابق فاسق۔

یعنی امت کے دو بڑے فرقوں میں سے، ایک فرقہ یوں گیا۔ اب دوسرے فرقے کے متعلق دیکھئے۔

شیعہ کا فتوٰے اہلِ سنّت، بلکہ تمام دوسرے مسلمانوں پر

سوائے فرقہ اثنا عشریہ امامیہ کسے ناجی نیست۔ کشتہ شود خواہ بموت میرد۔

[1] ہم نے ان فتووں میں سے بیشتر کو، محترم پیر رشید الدولہ صاحب، سجادہ نشین حضرت شاہ دولہ صاحب۔ گجرات کے ایک مقالہ سے لیا ہے، جسے ادارہ علیہ ہندیہ، اچھرہ لاہور، نے شائع کیا تھا۔ اور جس کا عنوان تھا۔ کفر زار اسلام، یعنی مولوی کا غلط مذہب۔ ویسے بعض دوسرے ماخذ والے بھی وہیں سے نقل کئے گئے ہیں۔ اس کے لئے ہم پیر صاحب کے شکر گزار ہیں۔

(ترجمہ) سوائے فرقہ امامیہ، اثنا عشریہ، کوئی بھی جنتی نہیں۔ خواہ وہ قتل ہو جائے یا اپنی موت مرے۔ (حدیقۃ الشہداء صفحہ ۶۵)

شیعہ اور غیر شیعہ کا معاملہ یوں صاف ہو گیا۔ اب سُنّیوں کی طرف آئیے۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، ان میں دو بڑے فرقے ہیں ــــ مقلد اور غیر مقلد ہیں۔ مقلدین کو عام طور پر حنفی یا اہلِ سُنّت کہا جاتا ہے۔ اور غیر مقلدین کو اہلِ حدیث۔

غیر مقلدین پر اہلِ سُنّت کا فتویٰ

(۱) فرقہ غیر مقلدین، جن کی علامت ظاہری اس ملک میں آمین بالجہر۔ رفع یدین۔ اور نماز میں ہاتھ سینے پر باندھنا اور امام کے پیچھے الحمد پڑھنا ہے۔ اہلِ سنت سے خارج ہیں اور مثل دیگر فرق ضالہ، رافضی۔ وخارجی وغیرہ کے ہیں، کیونکہ ان کے بہت سے عقائد اور مسائل مخالف اہلِ سنت کے ہیں۔ ان کے پیچھے نماز درست نہیں۔ ان سے مخالطت ومجالست کرنا، اور ان کو اپنی خوشی سے مسجد میں آنے دینا شرعاً ممنوع ہے۔

(اس کے نیچے تقریباً ستر علماء کی مہریں ثبت ہیں۔

بحوالہ جامع الشواہد فی اخراج الوہابین عن المساجد۔ صفحہ)

(۲) پس تقلید کو حرام اور مقلدین کو مشرک کہنے والا شرعاً کافر بلکہ مرتد ہوا۔

(انتظام المساجد باخراج اہل فتن عن المساجد)

(۳) علماء اور مفتیان وقت پر لازم ہے کہ بجرد مسموع ہونے ایسے امر کے، اس کے کفر اور ارتداد کے فتوے دینے میں تردد نہ کریں، ورنہ زمرۂ مرتدین میں یہ بھی شامل ہوں گے۔ (ایضاً)

(۴) مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی نے غیر مقلدین کے تمام گروہوں کے نام بنام عقائد لکھ کر فتویٰ لکھا ہے کہ

یہ طائفے سب کے سب کافر و مرتد ہیں۔ اور جو ان کے کفر و عذاب میں شک کرے وہ خود کافر ہے۔ (کتاب حسام الحرمین)

مقلدین کے خلاف غیر مقلدین کا فتویٰ

(۱) کیا فرماتے ہیں علمائے دین اور مفتیان شرع متین اس امر میں کہ یہ گروہ مقلدین جو ایک

امام کی تقلید کرتے ہیں، اہل سنت والجماعت میں داخل ہیں یا نہیں اور ان کے پیچھے نماز درست ہے یا نہیں۔ اور ان کو اپنی مسجد میں آنے دینا اور ان کے ساتھ مخالطت اور مجالست جائز ہے یا نہیں۔

جواب۔ بیشک نماز ایسے مقلدین کے پیچھے جائز نہیں ہوگی کہ ان لوگوں کے عقائد اور اعمال مخالف اہل سنت والجماعت ہیں۔ بلکہ بعض عقیدہ اور عمل موجب شرک اور بعض مفسد نماز ہیں۔ ایسے مقلدوں کو مسجد میں آنے دینا شرعاً درست نہیں۔

اس کے نیچے (۱۹) مولوی صاحبان کی مہریں ثبت ہیں۔

(بحوالہ کتاب مجموعہ فتاوی صفحہ ۵۵-۵۴)

(۲) نواب صدیق حسن خاں صاحب (مرحوم) فرماتے ہیں۔

مقلدین پر اطلاق لفظ مشرکین کا۔ تقلید پر اطلاق لفظ شرک کا کیا جاتا ہے۔ دنیا میں آجکل اکثر لوگ مقلد پیشہ ہیں۔ وما یومن اکثرھم الا وھم مشرکون۔ یہ آیت ان پر بخوبی صادق ہے۔ (اقتراب الساعۃ صفحہ ۱۹)

صرف حنفی نہیں بلکہ سب کے سب

چاروں اماموں کے پیرو اور چاروں طریقوں کے متبع۔ یعنی حنفی۔ شافعی۔ مالکی۔ حنبلی۔ اور چشتیہ۔ قادریہ۔ نقشبندیہ، مجددیہ۔ سب لوگ کافر ہیں۔

(جامع الشواہد صفحہ ۲)

دیوبندیوں کے خلاف تین سو علماء کا فتویٰ

وہابیہ دیوبندیہ اپنی تمام عبارتوں میں، تمام اولیاء۔ انبیاء۔ حتیٰ کہ حضرت سید الاولین والآخرین (صلعم) اور خاص ذات باری تعالیٰ کی اہانت اور ہتک کرنے کی وجہ سے قطعاً مرتد اور کافر ہیں۔ اور ان کا ارتداد اور کفر سخت سے سخت درجہ تک پہنچ چکا ہے۔ ایسا کہ جو ان مرتدوں اور کافروں کے ارتداد اور کفر میں ذرا بھی شک کرے مرتد اور کافر ہے۔ مسلمانوں کو چاہیئے کہ ان سے بالکل ہی محترز اور مجتنب رہیں۔ ان کے پیچھے نماز پڑھنے کا تو

ذکر ہی کیا ہے، اپنے پیچھے بھی ان کو نماز نہ پڑھنے دیں اور نہ ہی مسجدوں میں گھسنے دیں۔ نہ ان کا ذبیحہ کھائیں۔ نہ ان کی شادی غمی میں شریک ہوں۔ نہ اپنے پاس ان کو آنے دیں۔ یہ بیمار ہوں تو عیادت کو نہ جائیں۔ مریں تو گاڑنے تو پنے میں شرکت نہ کریں۔ مسلمانوں کے قبرستان میں جگہ نہ دیں۔ غرض ان سے بالکل احتیاط و اجتناب رکھیں۔ (دیکھئے تین صد علماء کا متفقہ فتویٰ، المشتہر محمد ابراہیم بھاگلپوری)۔

دیوبندیوں کو اقلیت قرار دیا جائے

مارچ ۱۹۵۳ء میں کراچی کے در و دیوار پر ایک اشتہار چسپاں کیا گیا تھا جس کا عنوان تھا

مطالبات
فرقہ دیوبندیہ کو علیحدہ اقلیتی فرقہ تسلیم کیا جائے

اس اشتہار میں، منجملہ دیگر امور لکھا تھا کہ

جس طرح سکھ ہندوؤں سے نکلے لیکن ہندو نہیں ہیں۔ یا انگلینڈ کے پراٹسٹنٹ رومن کیتھلک سے نکلے مگر رومن نہیں۔ اسی طرح دیوبندی فرقہ اہل سنت والجماعت سے نکلا مگر اہل سنت والجماعت نہیں۔ اقلیتی فرقہ دیوبندیہ کے نمائندگان خصوصی۔ مفتی محمد شفیع صاحب۔ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی۔ مولانا احتشام الحق صاحب۔ مسٹر ابوالاعلیٰ مودودی وغیرہم ہیں۔

اس کے بعد مطالبہ یہ پیش کیا گیا تھا کہ اس فرقہ کو اقلیت تسلیم کیا جائے۔ اس اشتہار کے نیچے ۲۰ حضرات کے دستخط تھے۔

(طلوع اسلام، مئی ۱۹۵۳ء صفحہ ۶۴)۔

بریلویوں کے خلاف دیوبندیوں کا فتویٰ

مولوی سید محمد مرتضیٰ صاحب، دیوبندی نے اپنی کتاب میں، مولوی احمد رضا خاں صاحب کو کافر۔ اکفر۔ دجالِ مائتہ حاضرہ۔ مرتد۔ خارج از اسلام وغیرہ ثابت کیا ہے۔

(رسالہ رد التکفیر علی الفحاش التنظیر)

دوسری طرف

مولانا احمد رضا خاں صاحبؒ (بریلوی) نے مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ (بانی دارالعلوم دیوبند) اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ وغیرہ کے عقائد کا ذکر کرکے لکھا ہے کہ کلھم مرتدون باجماع الاسلام۔ (یہ سب باجماع الاسلام مرتد ہیں)۔ اس فتوے پر علماء حرمین شریفین اور دیگر مفتیوں اور قاضیوں کے دستخط اور مہریں ثبت ہیں۔ ان کی تین وجوہ تکفیر بیان کی گئی ہیں (۱) ختم نبوت کا انکار کرتے ہیں (۲) آنحضرتؐ کی توہین کرتے ہیں۔ (۳) امکان کذب باری تعالیٰ۔

اس لئے ان کے متعلق لکھا ہے کہ

جو ان کے کافر ہونے میں شک کرے۔ وہ بھی کافر ہے۔

(حسام الحرمین صفحہ ۳ تا ۱۰۰)

آپ نے غور فرمایا؟ پاکستان میں اس وقت یہی بڑے بڑے فرقے ہیں۔۔۔ شیعہ، سنّی، حنفی، اہلحدیث دیوبندی، بریلوی، یا ارباب طریقت میں، چشتیہ، قادریہ، نقشبندیہ وغیرہ۔ ان سب کے خلاف کفر و ارتداد کے فتوے لگ چکے ہیں۔

کیا ان فتووں کی رُو سے پاکستان میں ایک شخص بھی مسلمان باقی رہ جاتا ہے۔؟

پھر مختلف فرقوں کی تکفیر تک ہی اکتفا نہیں کیا گیا۔ ان فرقوں کے ممتاز افراد کے خلاف نام بنام فتاویٰ صادر کئے گئے اور انہیں بدعت و شنام بنایا گیا۔ مثلاً

مولانا نذیر حسین دہلویؒ

انہیں محبا دل۔ مرتاب۔ متبع ہوائے نفس۔ حاسد۔ بددیانت۔ منحرف قرار دیا گیا

(رسالہ التحقیق المزید لمن ھوفی بطن امہ السعید.....)

ان کے ساتھ مولوی محمد حسین بٹالوی مرحوم

کو شامل کرکے انہیں

شیاطین۔ ملحد۔ بیوقوف۔ بے شعور۔ بے دین۔ وغیرہ کہا گیا۔

اس فتویٰ پر ۳۸ علماء حرمین شریفین اور علمائے عجم کی مہریں ثبت ہیں۔ (کتاب نذرالحق)

مولانا ثناء اللہ امرتسری مرحوم

کے خلاف جو فتاویٰ شائع کئے گئے اور جنہیں مکہ معظمہ جا کر حاصل کیا گیا، ان میں ان کی تفسیر کے متعلق لکھا ہے۔

ایک بدعتی اور گمراہ کا کلام ہے۔ انہوں نے اپنی تفسیر میں حلولیہ۔ اتحادیہ۔ جہمیہ۔ اور معتزلہ مذہب کو جمع کر رکھا ہے۔ نہ تو مولوی ثناء اللہ سے علم حاصل کرنا جائز ہے۔ نہ اس کی اقتداء جائز ہے۔ نہ اس کی شہادت قبول کی جائے۔ نہ اس کی اقامت صحیح ہے۔ اس کے کفر اور مرتد ہونے میں کوئی شک نہیں۔ ...... اس کی تفسیر اس قابل ہے کہ اس کا مطالعہ کیا جائے۔ بلکہ تردید کی غرض سے دیکھنے کے سوا اس کا دیکھنا بھی حرام ہے۔

(فیصلہ مکہ صفحہ ۲۰-۱۵)

مولانا حسین احمد مدنی مرحوم

مولانا مدنی نے مکتوب ۳۰ کے صفحہ ۱۰۰ پر روایات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

احادیث خواہ قدسیہ ہوں یا غیر قدسیہ، ان کے نقل کرنے والے اتنے کثیر نفوس نہیں ہیں۔ اس لئے ان میں احتمال جھوٹ یا غلطی کا آتا ہے۔ اس لئے قطعی الثبوت نہیں ہوں گی اور ان کا منکر کافر نہیں ہوگا۔ یہ تو فرق ہے ہمارے لئے۔ صحابہؓ کے لئے نہیں۔ ان کے لئے قرآن اور ارشاداتِ نبویؐ قطعی الثبوت ہیں۔ وہ اگر ایک حدیث سننے کے بعد منکر ہوں تو کفر لازم آئیگا۔

مولانا مرحوم کے اس اقتباس پر حکیم محمد اشرف سندھیلوی کے قلم سے "حیرت انگیز انکار حدیث" کے عنوان سے جماعت اہل حدیث کے اخبار "اہلحدیث" بابت یکم جولائی ۱۹۶۰ء میں ایک تبصرہ شائع ہوا۔ جس کا متن، ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور کی ۱۸ نومبر ۱۹۶۰ء کی اشاعت میں بالفاظ ذیل شائع ہوا ہے۔

حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، دیوبندی، اول درجہ کے عالم اور خادم قرآن و حدیث بزرگ گزرے ہیں۔ آپ محتاج تعارف نہیں۔ مگر آپ کا ایک مکتوب دیکھ کر بہت ہی صدمہ ہوا جس میں انکار حدیث کا بھیانک تصور موجود ہے۔ اس تصور سے معتزلہ، جہمیہ کے علاوہ نیچریت، چکڑالویت اور پرویزیت کا ریکارڈ بھی ختم ہو گیا۔

ان سب پر جن کا ریکارڈ مولانا مدنی (مرحوم) نے ختم کر دیا ہے، کفر کے فتوے لگ چکے ہیں۔ اس سے مولانا مدنی کے کفر کی بات واضح ہو جاتی ہے۔

مودودی صاحب کے خلاف

سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اور ان کی جماعت کے خلاف، قریب قریب ہر فرقے کے علماء کی طرف سے فتوے لگ چکے ہیں۔ جن میں ان کی تحریک کے متعلق کہا گیا ہے کہ

یہ تحریک کوئی نئی تحریک نہیں۔ یہ وہی پرانی خارجیت ہے جو نئے نئے روپ اختیار کر چکی ہے۔

(دارالعلوم منظر الاسلام۔ بریلی)

مفتی مظہر اللہ صاحب (جامع فتحپوری۔ دہلی) اپنے فتوے میں لکھتے ہیں۔

ان باتوں کا ظاہر تو یہی ہے کہ مسلم کو اہل سنت سے خارج کرنے والی ہیں اور یقیناً تفریق بین المسلمین کی موجب اور نئے فرقے کے پیدا کرنے کے لئے بنیاد ہے لیکن بنظر تعمق نظر کیجئے تو کفر تک پہنچانے والی ہیں ـــ ایسی صورت میں نیا فرقہ پیدا کرنے والی نہیں بلکہ فرقہ مرتدین میں داخل کرنے والی ہیں۔

علی گڑھ کے مولانا حفیظ اللہ صاحب نے لکھا ہے۔

جو حکم مسجد ضرار کا ہے اس جیسے حکم میں یہ جماعت بھی داخل ہے۔

"مسجد ضرار" کے متعلق قرآن کریم میں "کفرا" کا لفظ آیا ہے، لہٰذا ان کے متعلق بھی کفر کا حکم ہوا۔

مولانا اعزاز علی صاحب (دیوبندی) اپنے فتویٰ میں رقمطراز ہیں۔

میرے نزدیک یہ جماعت اپنے اسلاف (یعنی میرزائی) سے بھی مسلمانوں کے دین کے لئے زیادہ ضرر رساں ہے۔

مفتی سید مہدی حسن صاحب، صدر مفتی دارالعلوم دیوبند، اپنے فتوے میں لکھتے ہیں۔

اگر کوئی شخص مسجد کا امام مودودی صاحب کا ہم خیال ہو تو ایسے شخص کے پیچھے نماز مکروہ ہے۔

مولانا حسین احمد صاحب مدنی (مرحوم) مودودی صاحب کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ

آپ کی تحریک "اسلامی" خلف سلف صالحین مثل معتزلہ۔ خوارج۔ روافض۔ جہمیہ وغیرہ فرق قدیمہ اور مثل قادیانی۔ چکڑالوی۔ مشرقی۔ نیچری۔ مہدوی۔ بہائی وغیرہ فرق جدیدہ

ایک نیا اسلام بنانا چاہتی ہے اور وہ ان اصول و عقائد و اعمال پر مشتمل ہے جو کہ اہلِ سنت والجماعت اور سلف کے خلاف ہیں۔

مولانا احمد علی (مرحوم) کی جمعیت علماء (لاہور) نے مودودی صاحب کے متعلق ایک اشتہار میں لکھا تھا کہ

ان کا اجتہاد قرآن کے مقابلہ میں شیطنی ہے

اور

مرزا قادیانی نے نئی شریعت، نئی نبوت کا دروازہ کھولا مودودی صاحب نے پرانی شریعت کے پرانے مسئلوں کو بدل دیا۔

اس کے بعد لکھا تھا کہ

اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو مودودی صاحب اور اس نام نہاد اسلامی جماعت کے شر اور دھوکے سے بچائے۔

سرسید احمد خان پر فتوے

سرسید مرحوم کے خلاف تکفیر و تفسیق کی جو مہم طوفانِ بلا انگیز کی طرح اٹھی تھی اس کے متعلق، مولانا حالی کی "حیاتِ جاوید" میں شرح و بسط سے لکھا ہے۔ اس کے چیدہ چیدہ فقرے ملاحظہ فرمائیے۔

(ان رسائل میں) سرسید کو ملحد۔ لامذہب۔ کرسٹان۔ نیچری۔ دہریہ۔ دجال۔ اور کیا کیا خطاب دیئے گئے۔ ان کے کفر کے فتووں پر شہر شہر اور قصبہ قصبہ کے مولویوں سے مہریں اور دستخط کرائے گئے۔ یہاں تک کہ جو لوگ سرسید کی تکفیر پر سکوت اختیار کرتے تھے ان کی بھی تکفیر ہونے لگی۔ (صفحہ ۴۴)

مسلمانوں کے جتنے فرقے ہندوستان میں ہیں، کیا سنی کیا شیعہ، کیا مقلد کیا غیر مقلد کیا وہابی کیا بدعتی، سب فرقوں کے مشہور اور غیر مشہور عالموں اور مولویوں کی ان فتووں پر مہریں یا دستخط ہیں ...... مولوی عبدالحی صاحب مرحوم لکھنوی، جو علمائے فرنگی محل میں نہایت نامور تھے، مفصلہ عبارت میں تحریر فرماتے ہیں۔ " وجود شیطان اور جن کا منصوص قطعی ہیں اور منکر اس کا شیطان ہے بلکہ اس سے بھی زائد، کیونکہ خود شیطان کو بھی اپنے وجود سے انکار نہیں ...... اور وجود آسمان منصوص قرآنی ہے۔ منکر اس کا مبتلائے وسواس شیطانی ہے ...... (یہ شخص) مخرب دین، ابلیس لعین کے وسوسہ سے صورتِ اسلام میں تخریب

دینِ محمدی کی منکر ہیں ہے اور بنامِ تجدید، مدرسہ جدیدہ افساد شریعت اس کی منظورِ نظر ہے۔ جو چیزیں اس کے نزدیک موجب تہذیب ہیں اہلِ سنت کے نزدیک باعثِ تخریب ہیں (صفحہ ۶۲۹ — ۶۲۷)۔

ایک فتویٰ مکہ معظمہ سے منگوایا گیا جس پر "مذاہب اربعہ" کے مفتیوں نے مہریں لگائیں۔ اس میں لکھا تھا کہ

یہ شخص یا تو ملحد ہے یا شرع سے کفر کی کسی جانب مائل ہو گیا ہے۔ یا زندیق ہے کہ کوئی دین نہیں رکھتا، یا اباحتی ہے کیونکہ منخنقہ کا کھانا مباح بتاتا ہے۔ اور اہلِ مذہب (حنفی) کے بیانات سے مفہوم ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں کی توبہ گرفتاری کے بعد قبول نہیں ہوتی۔ پس اگر اس شخص نے گرفتاری سے پہلے توبہ کر لی اور ان گمراہیوں سے رجوع کی اور توبہ کی علامتیں اس سے ظاہر ہو گئیں تو قتل نہ کیا جائے، ورنہ اس کا قتل واجب ہے دینِ حق کی حفاظت کے لئے۔ (صفحہ ۶۳۳)

علی گڑھ کالج کے متعلق

یہ مدرسہ جس کو خدا برباد اور اس کے بانی کو ہلاک کرے، اس کی اعانت جائز نہیں ہے۔ اور اگر مدرسہ بن کر تیار ہو جائے تو اس کو منہدم کرنا اور اس کے بانی سے اور اس کے مددگاروں سے سخت انتقام لینا واجب ہے۔ اور ہر شخص پر جس میں حمیتِ اسلامی ہو، واجب ہے اس مدرسہ کی مخالفت، جہاں تک کہ قدرت ہو، اور ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ دل سے اس کا مخالف ہو (صفحہ ۶۳۴)

آپ سوچئے کہ اگر ان فتووں کے مطابق، اس وقت علی گڑھ کالج نہ بنتا۔ یا تباہ کر دیا جاتا، تو آج ہمارا کیا حشر ہوتا؟ کم از کم اتنا تو یقین ہے کہ پاکستان کی جداگانہ مملکت کبھی وجود میں نہ آتی۔ ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہندو کے غلام رہتے!

سرسید کا جواب

سرسید نے ان فتووں کا جو جواب دیا تھا، اس کا ایک ٹکڑا ملاحظہ فرمائیے۔ وہ لکھتے ہیں۔

ہم کو ملحد اور زندیق اور لامذہب کہنا کچھ تعجب نہیں ہے۔ کیونکہ ہماری قوم نے خدائے واحد ذوالجلال کے سوا باپ دادا کے رسم و رواج کو اور اپنے قدیمی چال چلن کو دوسرا خدا

مانا ہے اور پیغمبر آخر الزمان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور بہت سے پیغمبر پیدا کئے ہیں، کتاب اللہ کے سوا انسانوں کی بنی ہوئی بہت سی کتابوں کو قرآن بنایا ہے اور ہم اُس جھوٹے خدا اور فرضی پیغمبروں اور جعلی قرآنوں کو ایسا ہی برباد کرنے والے ہیں جیسے ہمارے جدامجد ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ آزر کے بتوں کو توڑنے والے تھے۔ ہم سچے خدائے واحد ذوالجلال کا جلال اور سچے پیغمبر محمدؐ رسول اللہ کی نبوت اور سچی کتاب اللہ کی اطاعت دنیا میں قائم کرنی چاہتے ہیں۔ پھر وہ لوگ ہم کو ملحد و زندیق و لامذہب کہیں اور نہ سمجھیں تو کیا کہیں اور کیا سمجھیں؟ کیونکہ ہم ان کے خداؤں اور پیغمبروں اور قرآنوں کو نہیں مانتے۔ (حیات جاوید صفحہ ۶۲۶)

بلکہ ہمارے نزدیک کفر کے ان فتووں کا جواب، اس سے بہتر کوئی نہیں تھا جو سرسیدؒ نے اس ایک شعر میں دیدیا تھا۔ کہ

خدا دارم۔ دلے بریاں ز عشقِ مصطفیٰؐ دارم
ندارد ہیچ کافر ساز و سامانے کہ من دارم

قائدِ اعظمؒ و اقبالؒ سرسیدؒ نے تو پھر بھی مذہبی امور کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ ان حضرات نے قائدِ اعظمؒ کو کافرِ اعظم کہہ کر پکارا تھا۔ اور حکیم الامت علامہ اقبالؒ جیسے مردِ مومن پر بھی کفر کا فتویٰ صادر کیا گیا تھا۔

☆

قرونِ اولیٰ کے بزرگانِ عظام پر کفر و ارتداد کے فتوے

ہمارے ہاں کافر گری کا یہ مشغلہ اسی زمانے کی پیداوار نہیں۔ ہماری بدقسمتی سے یہ مرض بہت پرانا ہے، اور اُمت کے بزرگانِ عظام میں سے شاید ہی کوئی ہوگا جو اس کی زد سے بچ گیا ہو۔ اس سلسلہ میں بڑی لمبی چوڑی فہرست پیش کی جاسکتی ہے، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس مقصد کے لئے ذیل کے چند اسمائے گرامی کا درج کر دینا کافی ہوگا۔ (واضح رہے کہ ہم نے صحابہ کبارؓ کے نام اس فہرست سے عمداً خارج کر دیئے ہیں کیونکہ ہم اس کی جسارت نہیں کر سکتے) صحابہؓ کے بعد کے دور کے بزرگانِ کرام کے متعلق دیکھئے۔

حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رضؓ

کی بہت بے ادبی ہوئی۔ بعض نے جاہل بعض نے بدعتی بعض نے زندیق اور بعض نے کافر کہا۔ انکار کرنے پر عہدۂ قضا سے آپ پر سختی ہوئی..... آخر قید خانہ میں زہر دیئے گئے اور ماہ رجب ۱۵۰ھ میں آپ نے وفات پائی۔ ابو یوسف ابن خالد نے آپ سے وتر کا مسئلہ پوچھا آپ نے فرمایا وتر واجب ہے۔ تو یوسف بن خالد نے کہا کفرت یا ابو حنیفہ۔

ابو عبداللہ امام محمدؐ بن ادریس شافعی رضؓ

آپ کو ابلیس کہا گیا۔ رفض کی طرف نسبت کر کے قید کیا گیا۔ آپ کے مرنے کی دعائیں کی گئیں یمن سے بغداد تک بے ادبی۔ بے حرمتی اور بے عزتی سے قید کر کے لے جایا گیا۔ وفات آپ کی رجب ۲۰۴ھ میں ہوئی۔

حضرت امام احمدؒ بن حنبل رضؓ

آپ بہت متقی اور پرہیزگار امام تھے۔ آپ کو اٹھائیس مہینے قید رکھا گیا۔ وزنی زنجیریں آپ کے پاؤں میں ڈالی گئیں۔ مجلسوں میں بلا کر ذلیل کئے گئے آپ کے منہ پر طمانچے مارے گئے اور تھوکا گیا۔ آپ کے ہمراہ ابو قیس زیادی۔ نصر بن شمیل مواریری۔ ابو نصر، تمار علی بن مقاتل شبیر بن ابو حیدی وغیرہ کو پولیس کی حراست میں رکھا گیا۔ ہر شام کو جیل خانہ سے نکال کر کوڑے مارے جاتے تھے۔ یہ سب کچھ قدم و خلق قرآن کے باعث ہوا۔

ابو عبداللہ امام مالک بن انسؓ رضؓ

آپ مدینہ منورہ کے رہنے والے تھے آپ کو سخت اذیتیں دی گئیں آپ کی مشکیں اس بے دردی سے کسی گئی تھیں کہ آپ کا ہاتھ بازو سے اکھڑ گیا۔ آپ قید میں بھی رہے آپ کو کوڑے بھی لگائے گئے۔

امام محمد بن اسمٰعیل بخاریؒ

کو دیس سے نکالا گیا۔ خدا تعالیٰ کی زمین آپ پر تنگ کر دی گئی۔ اب تک آپ کو بُرا کہنے والے مولوی موجود ہیں۔ غرہ شوال ۲۵۶ھ میں وفات پائی۔

(از ترجمہ فارسی مشکوٰۃ شیخ عبدالحق۔ مدینہ مجددیہ۔ صفحہ ۷۳)

ابو عبدالرحمٰن امام نسائیؒ

کی مسجد میں بے عزتی ہوئی اور ایسا مارا کہ آپ کی وفات اسی وجہ سے ہوئی۔ سن وفات ۳۰۳ھ

(از ترجمہ مشکوٰۃ فارسی)

شیخ الاسلام محی الدین ابو محمد عبدالقادر الحسنی والحسینی الجیلانیؒ

کو فقہا نے کافر کہا۔

شیخ محی الدین ابن عربیؒ

جو شیخ اکبر کہلاتے ہیں ان کو اکفر کہا گیا بلکہ حضرات مولویوں نے یہ فتویٰ دیا کہ کفرہ اشد من کفر الیہود والنصاریٰ۔ مزید براں ان کے تمام گروہ پر تکفیر کا فتویٰ جاری کیا گیا حتیٰ کہ ان کے کفر پر شک کرنے والوں پر بھی کفر کا فتویٰ دیا گیا۔

مولانا جلال الدین رومیؒ۔ مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ۔ شیخ فریدالدین عطارؒ

کو کافر کہا گیا اور جو شخص ان کو کافر نہ کہے اس کے متعلق بھی کفر کا فتویٰ دیا گیا۔

امام غزالیؒ

جیسے محقق کو کافر قرار دیا گیا اور ان کی کتابوں کو جلانا اور ان پر لعنت کرنا ثواب سمجھا گیا۔
(کتابوں کو جلوانا اور جلانے کے متعلق مطالبہ کرنا یہ پرانی رسم ہے۔)

امام ابن تیمیہؒ

کے متعلق شاہِ مصر نے حاجی برہان الدین سے قتل کا فتویٰ طلب کیا۔

امام حافظ ابن قیمؒ

کو قید کیا گیا۔ شہر بدر کیا گیا اور بے حد اذیتیں دی گئیں۔

امام ربانی مجدد الف ثانیؒ شیخ احمد فاروقیؒ

پر کفر کا فتویٰ دیا گیا۔ سخت بے ادبی کی گئی۔ مقصود یہ تھا کہ سجدۂ تعظیمی کے آپ قائل نہ تھے۔

شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ

پر بدعتی اور گمراہی کا الزام لگایا گیا۔

حضرت سید احمد بریلویؒ

کو کافر ملحد کہا گیا۔

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ

پر کفر کے فتوے مکہ مکرمہ کے مفتیوں سے لگوائے گئے۔

مولانا عبداللہ غزنویؒ

کو اعلائے کلمۃ الحق کی پاداش میں جلاوطن کیا گیا۔ اور دُرّے لگائے گئے۔

فتوے کیوں لگتے تھے؟ فتوے لگانے کی متعدد وجوہات اور مختلف مقاصد ہوتے تھے۔ مثلاً (۱) سیاسی مقاصد۔ جب کوئی بادشاہ یا حاکم کسی بڑی شخصیت کی طرف سے اپنے لئے خطرہ محسوس کرتا اور اسے اس کا بھی اندیشہ ہوتا کہ اس پر دلیسے ہاتھ ڈالنے سے رعایا بگڑ جائے گی، تو اس کے خلاف کفر کا فتویٰ حاصل کر لیا جاتا۔ اور اس طرح اس کانٹے کو نہایت آسانی سے راستے سے نکال دیا جاتا۔ یا جو شخص بادشاہ وقت سے مختلف عقیدہ رکھتا اُسے ذبح کر دیا جاتا۔ مثلاً دوسری صدی ہجری میں جعد بن درہم نے یہ کہا کہ

قرآن مخلوق ہے۔ اس پر کفر کا فتویٰ لگا دیا گیا۔ اور خالد بن عبداللہ والیٔ عراق نے اُسے عیدالاضحیٰ کے دن، بطور قربانی ذبح کیا۔ اس کے بعد حالات نے پلٹا کھایا۔ اور مامون الرشید خود قرآن کے مخلوق ہونے کا قائل ہو گیا۔ اب دوسرے گروہ پر کفر کے فتوے لگنے شروع ہو گئے اور امام احمد بن حنبلؒ جیسی شخصیت کو جس طرح قید و بند کی اذیتیں پہنچائی گئیں ان کے تصور سے روح کانپتی ہے۔ خلیفہ واثق نے احمد بن نصر کو اس عقیدہ کی بنا پر خود اپنے ہاتھ سے قتل کیا اور اس کے جسم کو سولی پر لٹکا دیا گیا اس کے کان میں ایک رقعہ رکھ دیا گیا جس میں لکھا تھا

یہ احمد بن نصر مشرک اور گمراہ کا سر ہے جس کو امیر المومنین نے
بغرض تقرب اپنے ہاتھ سے قتل کیا ہے۔

تاریخ اس قسم کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔

(۲) جب دین فرقوں میں بٹ جائے تو ہر فرقہ کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ مضبوط اور غالب رہے۔ فرقہ کو مضبوط رکھنے کے لئے اتنا ہی کافی نہیں ہوتا کہ اس کی افضلیت اور حقانیت کو ثابت کیا جائے۔ بلکہ یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ دوسرے فرقوں کی طرف سے نفرت دلائی جائے۔ اس طرح فرقوں کی باہمی کشمکش شروع ہوتی اور جاری رہتی ہے۔ اسے قرآن کریم نے بغیاً بینھم سے تعبیر کیا ہے (۲/۲۱۳)۔ یعنی ایک دوسرے کی ضد سے مخالفت کرنا۔ ایک فرقہ، دوسرے فرقے کے خلاف کفر کا فتویٰ اسی مقصد کے لئے لگاتا ہے۔

(۳) افراد کے خلاف کفر کے فتوے کا جذبہ حسد ہوتا ہے۔ چنانچہ امام غزالیؒ اپنے ایک رسالہ میں لکھتے ہیں کہ

جس شخص پر لوگ حسد نہ کریں اسے حقیر جان۔ اور جس کو کافر اور گمراہ نہ کہیں اس کو
ناچیز سمجھ (بحوالہ حیات جاوید، صفحہ ۲۳۷)

چنانچہ جن افراد پر کفر کے فتوے لگے ہیں، آپ دیکھیں گے کہ وہ اپنے دور کی ممتاز شخصیتیں تھیں اور ان کا جرم یہی تھا کہ وہ اپنے ہم عصروں سے کہیں آگے تھے۔ مذہبی پیشوائیت صرف ان لوگوں سے راضی رہ سکتی ہے جن کی ذہنی سطح ان سے نیچی یا (زیادہ سے زیادہ) ان کے برابر ہو۔ یعنی جو یا تو آنکھیں بند کر کے ان کے پیچھے پیچھے چلتا جائے یا انہی جیسا سوچے اور انہی کی سطح پر بات کرے۔ جونہی کسی نے ان سے بلند سطح پر سوچنا سمجھنا شروع کیا، ان کے دل میں حسد کے جذبات ابھرے۔ کفر و ارتداد کے فتوے انہی جذبات حسد و بغض کے مظاہرے ہوتے ہیں۔ آپ اُس فہرست پر نگاہ ڈالئے جو اوپر دی گئی ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ شخصیتیں، اپنے ہم عصروں کے مقابلہ میں کتنے بلند تھیں۔ اور ان کی بلندی کا ثبوت یہ ہے کہ آج (مثلاً) امام اعظمؒ۔ امام ابن تیمیہؒ۔ شاہ ولی اللہؒ۔ سرسیدؒ۔

اقبالؒ کا نام تاریخ کے صفحات پر درخشندہ موتیوں کی طرح چمکتا ہے اور جن لوگوں نے ان کے خلاف کفر کے فتوے لگائے تھے، انہیں کوئی جانتا پہچانتا بھی نہیں۔

کن باتوں پر کفر کا فتویٰ لگایا جاتا ہے

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، قرآن کریم نے مومن ہونے کے لئے یہ مطالبہ کیا ہے کہ وہ شخص

اللہ - انبیاء - کتب - ملائکہ - اور آخرت

پر ایمان رکھے۔ آپ کے دل میں یہ خیال گزرتا ہوگا کہ جن لوگوں پر کفر کے فتوے لگائے جاتے ہیں، وہ ان اجزائے ایمان میں سے کسی کا انکار کرتے ہوں گے! بالکل نہیں۔ یہ حضرات خدا کی ہستی پر ایمان رکھتے تھے۔ قرآن کریم سے پہلے کی تمام آسمانی کتابوں پر ایمان رکھتے تھے اور قرآن کو خدا کی آخری کتاب مانتے تھے۔ نبی اکرمؐ سے پہلے کے تمام انبیاء کرامؑ پر ایمان رکھتے تھے، اور نبی اکرمؐ کو خدا کا آخری نبی مانتے تھے۔ ملائکہ پر اور مرنے کے بعد کی زندگی پر ایمان رکھتے تھے۔ اس کے بعد آپ یقیناً حیران ہوں گے کہ وہ کونسی باتیں ہیں جن کی بنا پر ان کے خلاف کفر کے فتوے لگ جاتے تھے۔ سنئے کہ وہ کونسی باتیں ہیں۔ مثلاً

(۱) اگر کوئی کہے کہ میں نے اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھا تو وہ کافر ہے۔

(۲) اگر کہے کہ معدوم شے اللہ کو معلوم نہیں تو کافر۔

(۳) اگر کہے کہ میں جنوں سے معلوم کر کے خبر دیتا ہوں تو کافر

(۴) اگر کہے مجھے معلوم نہیں کہ آدم علیہ السلام نبی تھے یا نہیں تو کافر

(۵) اگر حضرت ابو بکرؓ کی خلافت کا انکار کرے تو کافر۔

(۶) اگر کسی کافر نے مسلمان سے کہا کہ مجھ پر اسلام پیش کر اس نے کہا کہ فلاں مولوی کے پاس جا تو کافر ہو گیا۔　　(فقہ اکبر مطبوعہ مصر صفحہ ۱۹۳)

(۷) اگر کسی مسلمان سے کہا گیا کہ کیا تو مومن ہے اس نے کہا مجھے معلوم نہیں تو کافر۔

(۸) جس نے کسی عالم سے بغیر سبب ظاہری کے بغض رکھا وہ کافر ہے۔

(۹) استخفاف علماء بالاتفاق علماء کفر ہے۔　　(صفحہ ۲۰۰۔ فقہ اکبر)

(نوٹ) مندرجہ بالا حوالہ جات کے لئے دیکھو کتب معتبرہ خیرۃ الحنفیہ۔ منحۃ الخالق۔ بحر الرائق، ہدیہ مجیدیہ وغیرہ

(۱۰) جس مسلمان نے (بطور مُعلم) اپنے آپ کو معلم اور استاد بنا لیا اور پھر ہاتھ میں سونٹا لے کر بچوں کو مارا کافر ہو گیا۔

(۱۱) اگر کسی مسلمان نے دوسرے مسلمان سے کہا کہ چلو، فلاں مجلس وعظ میں چلیں۔ اُس نے کہا جو باتیں وہاں مولوی صاحب بتلاتے ہیں ان پر عمل کون کر سکتا ہے۔ یا کہا مجھے ایسی مجلس سے کیا تعلق ؟ تو کافر ہو گیا۔

(۱۲) اگر کسی نے کسی کو کہا تو مجلس وعظ میں نہ جا اگر جائے گا تو تیری بیوی تجھ پر حرام ہو جائے گی یا اُسے طلاق ہو جائے گی۔ اگر ہنسی کے طور پر ایسا کہا تو کافر ہو گیا۔

(۱۳) اگر کسی عورت نے کسی عالم خاوند پر لعنت کی تو کافر ہو گئی۔

(۱۴) جس نے کسی عالم کو عویلم (یعنی چھوٹے مولوی صاحب یا مولوی شولوی) کہہ دیا تو کافر ہو گیا۔ (صفحہ ۱۵۷ فقہ اکبر)

(۱۵) اگر کسی نے کسی دوسرے سے کہا خدا کے واسطے یہ کام کر اُس نے کہا نہیں کرتا تو کافر ہو گیا۔ (صفحہ ۱۴۷)

(۱۶) علم اور علماء سے ہنسی کرنا کفر ہے۔

(۱۷) اگر کوئی اپنے غیر مسلم استاد کو یعنی (مجوسی یا ہندو عیسائی ماسٹر کو) عزت کے طور پر استاذی یعنی اے میرے استاد کہہ دے تو کافر ہو جائے گا۔ (جیسا کہ صلوٰۃ ظہیریہ میں ہے)

(۱۸) اگر کسی ذمی کی ٹوپی اپنے سر پر رکھے اور اس سے اس کی غرض گرمی سردی دور نہ کرنا ہو تو کافر۔

(۱۹) اگر کوئی ٹیچر یا ماسٹر کہے کہ یہود (یعنی غیر مسلم ہندو وغیرہ) مسلمانوں سے بہت اچھے ہیں کیونکہ وہ اپنے استادوں کا حق ادا کرتے ہیں تو کافر۔

(۲۰) اگر کہے کہ عیسائیت یہودیت سے اچھی ہے تو کافر۔

(۲۱) اگر کہے عیسائیت مجوسیت سے اچھی ہے تو کافر۔

(۲۲) اگر کہے ایمان بڑھتا ہے اور گھٹتا ہے تو کافر۔

غرضیکہ اس داستان کو کہاں تک طول دیا جائے۔

جو کچھ گذشتہ صفحات میں لکھا گیا ہے آپ اس پر غور کیجئے اور پھر سوچئے کہ کوئی مسلمان بھی ایسا ہے

جوان فتووں کی رو سے، کافر نہیں قرار دیا جا سکتا - ان حالات میں اگر

پرویز صاحب پر کفر کا فتویٰ

لگ گیا ہے تو اس میں کونسی تعجب کی بات ہے۔ اس اُمت میں شروع سے آجتک کفر کے فتوے سے بچا کون ہے!

ایک اہم سوال پرویز صاحب کے خلاف جو فتویٰ شائع کیا گیا ہے اس میں کہا گیا ہے کہ اس پر ہر مکتبِ فکر کے علماء دین، دیوبندی - بریلوی - اہل حدیث - سنی شیعہ سب متفق ہو چکے ہیں۔

یہاں سے ایک اہم سوال سامنے آتا ہے - ہم دیکھ چکے ہیں کہ دیوبندی - بریلوی - اہل حدیث - سنی - شیعہ میں سے ہر ایک فرقہ پر کفر کا فتویٰ لگ چکا ہے۔ سوال یہ ہے کہ

(۱) اگر کسی شخص یا فرقہ پر کفر کا فتویٰ لگنے سے وہ واقعی کافر ہو جاتا ہے، تو یہ حضرات جنہوں نے موجودہ فتویٰ شائع کیا ہے، جس کے سب (اُن فتووں کے مطابق جو اُن پر لگ چکے ہیں) کافر قرار پا چکے ہیں۔ تو جو لوگ خود "کافر" ٹھہرائے جا چکے ہوں وہ کسی دوسرے کے کفر و ایمان کا فیصلہ کرنے کا کیا حق رکھتے ہیں۔ وہ پہلے اپنے آپ کو تو مسلمان ثابت کریں؛ اور

(۲) اگر اُن فتووں کے باوجود یہ حضرات مسلمان ہیں۔ اور اُن فتووں سے اِن کے ایمان اور اسلام کا کچھ نہیں بگڑا، تو ان کے فتوے سے دوسرا شخص کس طرح کافر ہو سکتا ہے! جس طرح اُن فتووں کے باوجود یہ حضرات مسلمان کے مسلمان ہیں، اُسی طرح، اِن کے فتوے کے باوجود، پرویز صاحب اور ان کے ہم خیال بدستور مسلمان ہیں۔

ایک اور سوال

اس سے بھی بڑھ کر ایک اور سوال سامنے آتا ہے، اور وہ یہ کہ اِن حضرات کو (یا کسی اور کو) یہ اختیار کہاں سے مل جاتا ہے کہ وہ کسی کے کفر اور اسلام کا فیصلہ کریں؟ "علماء" کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے کسی مذہبی مدرسہ سے کچھ کتابیں پڑھی ہیں۔ تو کیا ان کتابوں کے پڑھ لینے سے کسی کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ جسے جی چاہے کافر قرار دیدے؟ باقی رہے مفتی۔ سو اسلامی سلطنت میں یہ ایک منصب تھا جس پر کوئی شخص

حکومت کی طرف سے تعینات ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی مفتی نہیں ہوتا تھا۔ جس طرح آجکل ایڈوکیٹ جنرل یا اٹارنی جنرل حکومت کی طرف سے تعینات ہوتے ہیں اور ہر وکیل اپنے آپ کو نہ ایڈوکیٹ جنرل وغیرہ قرار دے سکتا ہے اور نہ ہی اس منصب کے فرائض سرانجام دے سکتا ہے۔ مفتی کی حیثیت مشیر قانونی کی ہوتی تھی۔ اس کا کام فقط مشورہ یا رائے دینا تھا۔ فیصلہ کرنا نہیں تھا۔ فیصلہ حکومت خود کرتی تھی یا اس کی طرف سے مقرر کردہ قاضی۔ اب نہ وہ حکومتیں باقی ہیں۔ نہ ان کی طرف سے مقرر کردہ مفتی۔ لیکن یہ حضرات ابھی تک اپنے آپ کو انہی معنوں میں مفتی سمجھتے ہیں، اور صرف مفتی کے فرائض ہی سرانجام نہیں دیتے، بلکہ قاضی کی حیثیت سے فیصلے بھی صادر کرتے ہیں

اصل جرم کیا ہے؟

ایک اور سوال بھی قابل غور ہے۔ ایک غیر مسلم جب اسلام لانا چاہتا ہے تو اس سے صرف اس کا اقرار لیا جاتا ہے کہ وہ

اللہ - ملائکہ - انبیاء - کتب - اور آخرت

پر ایمان لاتا ہے۔ اس اقرار سے وہ مسلمان ہو جاتا ہے۔ مسلمان ہونے کے بعد وہ اسلام کے متعلق کچھ علم حاصل کرتا ہے۔ کچھ غور و فکر کرتا ہے۔ پھر وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ (مثلاً) ملائکہ سے مراد یہ ہے۔ آخرت کا مفہوم کچھ اس قسم کا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس سے اس پر کفر کا فتویٰ لگا دیا جاتا ہے، حالانکہ جن امور کو ماننے سے وہ کافر سے مسلمان ہوا تھا، انہیں وہ اب بھی مانتا ہے۔ اس غور و فکر سے وہ اس مقام سے آگے بڑھا ہے۔ پیچھے نہیں ہٹا۔ لیکن اس وقت وہ مسلمان تھا۔ اور اب وہ کافر ہو گیا۔ گویا جب وہ اسلام کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا تو وہ مسلمان تھا، اور جب اس نے اسلام کے متعلق کچھ سیکھا اور اس پر غور و فکر کیا تو وہ کافر ہو گیا، حالانکہ اس نے اُن اجزائے ایمان میں نہ کسی قسم کی تخفیف کی ہے، نہ ان میں اضافہ کیا ہے۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ اس کے غور و فکر کے نتائج سے متفق نہیں، وہ آپ کے نزدیک غلط ہیں۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اس سے کافر کیسے ہو گیا!

اور پیدائشی مسلمان سے کبھی اتنا اقرار بھی نہیں لیا جاتا جتنا نومسلم سے لیا جاتا ہے۔ نہ ہی اس سے کبھی یہ پوچھا جاتا ہے کہ وہ ملائکہ کو کس انداز سے مانتا ہے اور آخرت کے متعلق کیا سمجھتا ہے۔ ان میں سے بھی جو کبھی ان امور پر غور و فکر کرنے لگے اس پر کفر کے فتوے لگتے ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ یہ ساری مصیبت اس پر آتی ہے جو دین میں غور و فکر کرنے لگے۔ کافر وہی بنتا ہے۔

اگر کوئی ایسا نہ کرے، تو ان حضرات کو اس کے خلاف کوئی شکایت نہیں ہوتی۔ وہ مسلمان کا مسلمان رہتا ہے خواہ، وہ خدا رسول۔ وحی۔ آخرت سب کا انکار کر دے۔ مثلاً کمیونسٹ[1] ان تمام اجزائے ایمان کا انکار کرتے ہیں اور مسلمان بھی کہلاتے ہیں، لیکن ہم نے آج تک نہیں دیکھا کہ ہمارے علماء کرام نے ان کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کیا ہو۔ وقس علیٰ ہٰذا۔ اس سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ یہ حضرات کفر کا فتویٰ کس پر صادر فرماتے ہیں اور کیوں ایسا کرتے ہیں!

کتنے مسلمان بنائے

جیسا کہ ہم شروع میں بتا چکے ہیں، نبی اکرمؐ (اور صحابہ کبارؓ) نے ہزار مصیبتیں اٹھا کر اور لاکھ تکلیفیں جھیل کر کافروں کو مسلمان بنایا۔ اور یہی دین کی خدمت تھی۔ یہ حضرات جو بیک جنبشِ قلم و حرکتِ زبان، ہزاروں، لاکھوں مسلمانوں کو کافر بنا دیتے ہیں، ان سے پوچھئے کہ انہوں نے ساری عمر میں کتنے کافروں کو مسلمان بنایا! کافروں کو مسلمان بنانے کے لئے بڑی محنت درکار ہوتی ہے۔ مسلمان کو کافر قرار دینے میں لگتا ہی کیا ہے؟ اس لئے ان حضرات کے نزدیک جہاد نام ہے مسلمانوں کو کافر قرار دینے کا۔ اے کاش! ان تک کوئی اقبالؒ کا یہ پیغام پہنچا سکتا کہ

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

مسلمان کسے کہتے ہیں

کسی کافر کو مسلمان بنانا تو ایک طرف، یہ حضرات تو اتنا بھی نہیں بتا سکتے کہ مسلمان کہتے کسے ہیں! پرویز صاحب کے خلاف فتوے میں کہا گیا ہے کہ ان کے کفر پر ایک ہزار علماء کرام متفق اور متحد ہیں۔ لیکن جب انہی علماء کرام سے منیر تحقیقاتی کمیٹی نے یہ پوچھا کہ "مسلمان کسے کہتے ہیں" تو ان میں سے بہت سے تو کوئی جواب ہی نہیں دے سکے، اور جنہوں نے جواب دیا، ان میں سے کسی ایک کا جواب دوسرے سے نہیں ملتا تھا۔ چنانچہ ان کے جوابات کی روشنی میں کمیٹی نے لکھا کہ

یہ جوابات کسی تبصرہ کے محتاج نہیں۔ سوائے اس کے کہ ان فاضل علماء میں سے کوئی دو بھی اس

---

[1] طلوعِ اسلام نے بار بار اس امر کا اعلان کیا ہے کہ کوئی کمیونسٹ مسلمان نہیں ہو سکتا۔ نہ کوئی مسلمان کمیونسٹ ہو سکتا ہے لیکن ہمارے علماء کی طرف سے ایسا فتوے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔

اصولی مسئلہ کے جواب میں متفق نہیں ہیں (کہ مسلمان کسے کہتے ہیں)۔ اگر ہم اپنی طرف سے مسلمان کی کوئی تعریف پیش کریں اور وہ تعریف ان علماء کے فرمودات سے مختلف ہو، تو ہم فوراً دائرۂ اسلام سے خارج سمجھے جائیں گے۔ اور اگر ہم ان علماء کی بیان کردہ تعریف میں سے کسی ایک کو صحیح تسلیم کرلیں تو ہم صرف اس عالم کے نزدیک مسلمان ٹھیریں گے۔ باقی تمام کے نزدیک کافر قرار پائیں گے۔

(صفحہ ۲۱۸)

اِن فتووں کا اثر

وہ فرقہ جس کے خلاف کفر کا فتویٰ دیا جاتا ہے، کافر تو نہیں ہو جاتا، لیکن اس سے ملک کا امن ضرور تباہ ہو جاتا ہے۔ فتویٰ صادر کر کے عوام کے جذبات کو مشتعل کر دیا جاتا ہے۔ اس سے ہنگامے برپا ہوتے ہیں، فساد بھڑک ہو جاتے ہیں۔ ملت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ بھائی سے بھائی اور باپ سے بیٹا جدا ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ سیدھے سادے عوام سچ مچ سمجھ لیتے ہیں کہ اس فرقے کے لوگ کافر اور مرتد ہو گئے ہیں۔ فتوے میں لکھا ہوتا ہے کہ

(۱) ان کی بیویاں ان پر حرام ہو چکی ہیں۔

(۲) ان کے ساتھ بیاہ شادی حرام ہے۔

(۳) ان کے ساتھ ملنا جلنا۔ اٹھنا بیٹھنا۔ کھانا پینا۔ معاشرتی روابط رکھنا سب ناجائز ہیں۔

(۴) ان کی نماز جنازہ نہیں پڑھی جا سکتی۔

(۵) انہیں مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں کیا جا سکتا۔

(۶) یہ واجب القتل ہیں۔

غور کیجئے کہ جب عوام بچارے ان امور کو شریعت کا فیصلہ سمجھ کر ان پر عمل کرنے لگ جائیں تو ملک اور ملت کی حالت کیا ہو جائے گی! لیکن جب یہ ہنگامے فرو ہو جاتے ہیں تو خود وہ حضرات جنہوں نے اس قسم کا فتویٰ دیا تھا، ان لوگوں کے ساتھ، جن کے خلاف یہ فتویٰ دیا گیا تھا، اسی طرح ملتے جلتے ہیں۔ ان کی شادی بیاہ میں شریک ہوتے ہیں۔ ان کی نماز جنازہ پڑھتے ہیں۔ وہ بدستور مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہوتے ہیں۔ یعنی ان فتووں کا عملی نتیجہ، سوائے ہنگامے برپا کرنے اور مسلمانوں کو مسلمانوں کے ساتھ لڑانے کے کچھ نہیں ہوتا۔ آپ سوچئے کہ جس قوم میں یہ صورتِ حالات مسلسل جاری رہے، اس کا حشر کیا ہوگا؟

اس فتوے بازی اور کافر گری نے امت کے ساتھ کیا کیا ہے، اس کے لئے ہم مودودی صاحب کے

اُس اقتباس کو دہرا دینا کافی سمجھتے ہیں جسے سطورِ دسمبر میں درج کیا جا چکا ہے۔ وہ اپنی کتاب "تفہیمات۔ حصہ دوم" میں "فتنہ تکفیر" کے عنوان سے لکھتے ہیں۔

> مسلمانوں کے دورِ انحطاط میں جہاں اور بہت سے فتنے پیدا ہوئے ہیں وہاں ایک بڑا اور خطرناک فتنہ ایک دوسرے کو کافر اور فاسق ٹھیرانے اور ایک دوسرے پر لعنت کرنے کا بھی ہے۔ لوگوں نے اسلام کے سیدھے سادھے عقائد میں موشگافیاں کیں اور قیاس و تاویل سے ان کے اندر بہت سے ایسے فروع اور جزئیات پیدا کر لئے جو ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد تھے اور جن کی کوئی تصریح کتاب و سنت میں نہ تھی، یا اگر تھی بھی تو اللہ اور اس کے رسولؐ نے ان کو کوئی اہمیت نہ دی تھی۔ پھر ان اللہ کے بندوں نے (اللہ انہیں معاف فرمائے) اپنے وضع کردہ فروعی مسائل کے ساتھ اتنا اہتمام کیا کہ انہی پر ایمان کا مدار ٹھہرا دیا۔ ان کی بنیاد پر اسلام کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، بیسیوں فرقے بنا دیئے، اور ہر فرقے نے ایک دوسرے کو کافر، فاسق، گمراہ، دوزخی اور خدا جانے کیا کیا کہہ ڈالا۔ حالانکہ کفر و اسلام کے درمیان اللہ تعالیٰ نے کتابِ مبین میں ایک واضح خطِ امتیاز کھینچ دیا تھا اور کسی کو یہ حق نہ دیا تھا کہ اپنے اختیار سے جس چیز کو چاہے کفر اور جسے چاہے اسلام ٹھیرا لے۔ اس فتنے کی محرک خواہ تنگ نظری ہو نیک نیتی کے ساتھ، یا خود غرضی اور نفسانیت ہو بدنیتی کے ساتھ، بہرحال اس نے مسلمانوں کی جماعت کو جتنا نقصان پہنچایا ہے، شاید کسی اور چیز نے نہیں پہنچایا۔[1]

ایک آئینی سوال

لیکن اب اس سوال نے ایک آئینی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ آئینِ پاکستان میں یہ درج ہے کہ مملکتِ پاکستان

---

[1] جہاں تک پرویز صاحب کے خلاف کفر کے فتوے کا تعلق ہے، اس میں مودودی صاحب کے دستخط نہیں۔ لیکن انہوں نے کہا ہے کہ اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ وہ اس باب میں علماء سے متفق نہیں۔ یا اس اقدام پر علماء کو مطعون کیا جا سکتا ہے یعنی ایک طرف مودودی صاحب یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ اس تکفیر و تفسیق نے مسلمانوں کی جماعت کو اس قدر نقصان پہنچایا ہے ——— اور دوسری طرف ان لوگوں کی تائید و تحسین بھی کر رہے ہیں جو دوسروں پر کفر کے فتوے لگا کر مسلمانوں کی جماعت کو اس قدر نقصان پہنچا رہے ہیں

معشوقِ ما بہ شیوۂ ہر کس برابر است با ما شراب خورد و بہ زاہد نماز کرد

کے صدر کے لئے مسلمان ہونا ضروری ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اس عہدہ کے لئے جو شخص بطور امید وار کھڑا ہو۔

(۱) وہ اگر شیعہ ہے تو (ان حضرات کے فتوے کی رو سے) (وہ) سنیوں کے نزدیک مسلمان نہیں۔

(۲) اگر سنی ہے تو شیعہ حضرات کے نزدیک مسلمان نہیں۔

(۳) اگر معتقد ہے تو غیر مقلد اسے مسلمان تصور نہیں کریں گے۔

(۴) اگر غیر مقلد ہے، تو وہ مقلدین کے نزدیک مسلمان نہیں ہوگا۔

(۵) اگر دیوبندی عقیدہ کا ہے، تو بریلوی اسے مسلمان نہیں سمجھیں گے۔ اور اگر

(۶) بریلوی خیال کا ہے، تو دیوبندی اسے مسلمان تسلیم نہیں کریں گے۔

(وقس علی ھذا)۔ اب سوال یہ ہے کہ (اگر ان فتاوی کی واقعی کوئی حیثیت ہے، تو) اس بات کا فیصلہ کس طرح سے ہوگا کہ وہ امیدوار، مسلمان ہونے کی آئینی شرط پر پورا اترتا ہے۔ یا نہیں؟

"منیر کمیٹی" نے اس نکتہ کو اس سے بھی آگے بڑھایا تھا۔ اس نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ جس فرقہ کو کافر ٹھہرایا جاتا ہے، اس سے وابستہ افراد کو واجب القتل بھی قرار دیا جاتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ

> اگر (مثلاً) مولانا ابوالحسنات یا میرزا رضا احمد خان، رئیس مملکت ہو جائیں، تو وہ مولانا محمد شفیع صاحب (دیوبندی) یا مولانا داؤد غزنوی صاحب (اہلحدیث) کے قتل کا حکم صادر فرمائیں گے۔ اور اگر مولانا محمد شفیع صاحب رئیس مملکت ہو گئے تو وہ ان تمام لوگوں کو جو دیوبندیوں کو کافر قرار دیتے ہیں، واجب القتل قرار دیں گے...... یعنی شیعہ، سنی، دیوبندی، اہل حدیث، بریلوی میں سے جس جماعت کے ہاتھ میں اقتدار ہوگا، اس کے نزدیک باقی سب واجب القتل ہوں گے۔ (صفحہ ۲۱۹)

ہم قوم کے اہل فکر طبقہ سے، جنہوں نے (اور جن کی آنے والی نسلوں نے) اس ملک میں زندگی گزارنی ہے، دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا یہ مسئلہ ایسا نہیں جس پر نہایت سنجیدگی سے غور کر لے، اور ایسی تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت ہے جس سے ملک اس قسم کے آئے دن کے انتشار سے محفوظ رہے، اور مسلمانوں میں نفرت، عداوت اور تفرقہ کے بجائے، محبت، اخوت، اور اتحاد کی فضا پیدا ہو۔ اسی سے ہمارے پنپنے کی شکل پیدا ہو سکتی ہے۔ ورنہ ان فتوے بازیوں اور دشنام طرازیوں نے تو امت کو تباہ کر رکھا ہے۔

بیا تا کار ایں امت بسازیم — قمار زندگی مردانہ بازیم
چناں نالیم اندر مسجد شہر — کہ دل در سینۂ ملا گدازیم
(اقبالؒ)

پرویز صاحب اور مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے

مابین خط و کتابت

پرویز صاحب کا مکتوب

محترم مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے نام

باسمہٖ تعالیٰ

۲۵- بی گل برگ - لاہور

۲۰ر فروری ۱۹۶۳ء

محترمی مفتی صاحب السلام علیکم

مجھے ایک پمفلٹ موصول ہوا ہے جس کا عنوان ہے

علمائے اُمت کا متفقہ فتوے

پرویز کافر ہے

اس پمفلٹ کے تمہیدی بیان کے متعلق پمفلٹ میں لکھا ہے۔ کہ وہ آپ کا تحریر فرمودہ ہے۔ اس تمہیدی بیان کے آخر میں آپ نے لکھا ہے کہ:-

علماء کو کوئی خوشی نہیں کہ کسی مدعیٔ اسلام کے بارے میں اس کے خلاف کوئی رائے رکھیں۔ بلکہ فقہاء کی اس معاملہ میں انتہائی احتیاط ہر قدم پر ان کے سامنے ہے۔ مگر مجبور ہو کر یہ قدم اٹھانا پڑتا ہے۔ اور پھر بھی ہم یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہم سے کسی اقتباس کے اخذ کرنے میں کوئی فروگذاشت ہو۔ یا پرویز صاحب کا مفہوم ہم نے کسی جگہ غلط سمجھا ہو تو ہمیں مطلع فرمایا جاوے۔ ہم شکریہ کے ساتھ اس پر غور کریں گے۔

میں یہ عریضہ آپ کے بیان کے اسی آخری حصے کے سلسلے میں ارسال خدمت کر رہا ہوں۔

۲ — میں سب سے پہلے یہ دریافت کرنے کی جرأت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا یہ ضروری نہیں تھا کہ جب یہ اقتباسات اخذ کئے گئے تھے اور ان سے کچھ مفہوم مستنبط کیا گیا تھا، تو قبل اس کے کہ ان پر فتویٰ لیا جاتا اور اس فتوے کی اس طرح عام اشاعت کی جاتی، مجھ سے دریافت کر لیا جاتا کہ کیا یہ اقتباسات صحیح طور پر اخذ کئے گئے ہیں اور جو مفہوم تمہاری نظر منسوب کیا گیا ہے وہ صحیح ہے؟ کیا یہ عجیب انداز نہیں کہ پہلے فتویٰ صادر کر دیا جائے اور اس کے بعد پوچھا جائے کہ کیا ہم نے صحیح بنیادوں پر فتویٰ صادر کیا ہے؟

۳ — مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ میری تحریروں سے ایک ایک، آدھ آدھ فقرہ اِدھر اُدھر سے اخذ کر لیا گیا ہے اور انہیں "مکمل اقتباسات" کہہ کر پیش کر دیا گیا ہے۔ پھر ان منتشر ٹکڑوں سے جو مفہوم مرتب کیا گیا ہے وہ بے حد غلط اور گمراہ کن ہے۔

۴ — اب جبکہ آپ فتویٰ صادر فرما چکے ہیں اور اس کی اس طرح سے عام اشاعت بھی کر چکے ہیں تو اس کے بعد میری طرف سے وضاحت کیا مفید نتیجہ پیدا کر سکتی ہے؟ بایں ہمہ اگر آپ اس کا ذمہ لیں کہ جن مقامات پر یہ فتویٰ بھیجا گیا ہے وہاں میرا بیان بھی بھجوا دیا جائے گا تو میں ان تمام شقوں کے متعلق جن پر یہ فتویٰ شائع کیا گیا ہے اپنی تحریروں کے مکمل اقتباسات اور ان کا صحیح مفہوم ارسال خدمت کر دوں گا۔

۵ — سردست میں اتنا عرض کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ قرآن کریم نے اس شخص کو مومن کہا ہے۔

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ[1] (۲/۱۷۷)

میں ان تمام امور پر اُن تصریحات کے مطابق، جو قرآن کریم میں مذکور ہیں، ایمان رکھتا ہوں۔ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا آخری نبی اور رسول اور قرآن کریم کو تمام نوعِ انسان کے لئے ضابطۂ حیات مانتا ہوں۔

---

[1] "جو اللہ پر۔ آخرت کے دن پر۔ ملائکہ پر۔ کتابوں پر اور نبیوں پر ایمان لائے"

ارکانِ اسلام (نماز - روزہ - وغیرہ) کے متعلق میرا مسلک یہ ہے کہ امت کے مختلف فرقے انہیں جس جس طریق سے ادا کرتے چلے آ رہے ہیں، کسی شخص کو حق حاصل نہیں کہ ان میں کوئی رد و بدل کرے۔ یا کوئی نیا طریق وضع کرے۔

(ب) اطاعتِ خدا اور رسول کے متعلق جو کچھ میں کہتا ہوں وہ صرف یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صورت یہ نہیں تھی کہ ہر شخص اپنے اپنے مفہوم کے مطابق خدا اور رسولؐ کی اطاعت کر لیتا تھا۔ اسکی صحیح شکل یہ تھی کہ حضورؐ کے بعد جو خلافت علیٰ منہاج نبوت قائم ہوئی تھی اس سے پوچھا جاتا تھا کہ فلاں معاملہ میں خدا اور رسولؐ کی اطاعت کس طرح کی جائے گی۔ جو فیصلہ وہاں سے ملتا اُسے خدا اور رسولؐ کی اطاعت سمجھا جاتا۔ اسی سے وحدتِ اُمت قائم تھی۔ جب خلافت باقی نہ رہی تو خدا اور رسولؐ کی اطاعت انفرادی طور پر ہونے لگی۔ اس سے امت میں افتراق پیدا ہوا۔ اُمت میں دوبارہ وحدت پیدا کرنے کی صورت یہ ہے کہ پھر سے خلافت علیٰ منہاج نبوت قائم کی جائے۔ اور اُس کے فیصلوں کے مطابق خدا اور رسولؐ کی اطاعت کی جائے۔ اسی خلافت کو بغرضِ اختصار، مرکزِ ملت یا اسلامی نظام سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور میں اس کی بار بار وضاحت کر چکا ہوں۔ میں نہ ہر نظامِ حکومت کو اسلامی نظام کہتا ہوں، اور نہ اس کے فیصلوں کی اطاعت کو خدا اور رسولؐ کی اطاعت۔ میرے نزدیک خلافت علیٰ منہاجِ نبوت کے علاوہ کوئی نظام اسلامی نہیں کہلا سکتا۔ اور نہ اسے مرکزِ ملت کہا جا سکتا ہے۔

(ج) میں ہر اُس حدیث کو صحیح مانتا ہوں جو قرآن کے خلاف نہ ہو یا جس میں نبی اکرمؐ یا صحابہ کبارؓ کی شان میں کوئی طعن نہ پایا جاتا ہو۔ میں صرف اُن وضعی روایات کو "عجمی سازش" سے تعبیر کرتا ہوں جن میں غیر اسلامی معتقدات اور رسومات کو اسلام کے لباس میں پیش کیا گیا ہے۔

۶ — جس لٹریچر کی بنا پر مجھے کافر قرار دیا جا رہا ہے اس کے متعلق اتنا عرض کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ اس وقت ملک میں ہزاروں تعلیمیافتہ نوجوان ایسے ہیں جو اس لٹریچر کی بدولت اسلام کے گرویدہ ہیں۔ اگر یہ لٹریچر ان تک نہ پہنچتا تو وہ کبھی کے مغربی مادیت یا رُوس کی کمیونزم کی آغوش میں جا چکے ہوتے۔ میں اس بے پایاں کرم کے لئے بدرگاہِ رب العزۃ قدم قدم پر سجدہ ریز ہوں کہ اُس نے مجھے یہ توفیق عطا فرمائی۔

۷ — چونکہ یہ عریضہ آپ کے اس بیان کے ضمن میں ارسال کر رہا ہوں جو آپ نے پمفلٹ میں شائع کرنا ہے۔ اس لئے اپنے اس عریضہ کو بھی بغرضِ اشاعت پریس میں بھیج رہا ہوں۔ والسلام

خیر طلب — پرویز

مفتی صاحب کا خط
پرویز صاحب کے نام

جناب پرویز صاحب ـــــ السلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

عرض ہے کہ آپ کا مکتوب مورخہ ۲۰ فروری ۱۹۶۳ء مجھے ۲۴ فروری کو مل گیا تھا، مگر کاموں کا ہجوم ایسا ہے کہ مجھے جواب طلب مراسلات کی بلحاظ ضرورت و اہمیت کوئی ترتیب قائم کرنی پڑتی ہے، اور پھر اسی ترتیب سے جواب لکھتا ہوں، یہی وجہ ہے کہ جواب میں تاخیر ہوئی۔

جس وقت یہ فتویٰ توثیقی دستخط کے لئے میرے پاس آیا اُس وقت بھی اس امر کی اہمیت پوری طرح ملحوظ تھی اور اس کا اطمینان کرنا ضروری سمجھتا تھا کہ جن اقتباسات پر فتویٰ لیا جا رہا ہے وہ واقعی آپ ہی کی تحریروں کے اقتباسات ہوں، نیز یہ کہ ان عبارتوں کو سیاق و سباق سے اس طرح منقطع کر کے نہ پیش کیا گیا ہو کہ اصل مفہوم سے مختلف کوئی مفہوم بن جاتا ہو، یا کوئی ایسی شاذ عبارت ہو جو آپ کی کثیر التعداد تصانیف و مقالات میں پیش کردہ مسلک سے بالکل میل نہ کھاتی ہو، ـــــ اور ایسی ہی صورت میں تعبیر کی کوتاہی یا ذہنی سہو کا احتمال ہونے کے باعث وضاحتِ مراد کا موقع دیا جاتا ہے۔ـــ

متعلقہ عبارتوں میں کوئی ابہام و اغلاق بھی نہ تھا، ان عبارتوں کا مفہوم پورا واضح تھا، اور وہی مفہوم پیشِ نظر رکھا گیا تھا جو کسی اُردو جاننے والے کے نزدیک اس کا ہو سکتا ہے۔

ان حالات میں ظاہر ہے کہ فتویٰ دینے سے پہلے یا کسی مرحلہ پر آپ سے مراجعت کا کوئی سوال نہ تھا، ان صریح اور واضح عبارتوں میں ناقابلِ تاویل انداز کا کفر و الحاد دیکھ کر دیانتہً اس کی گنجائش نہ تھی کہ فتویٰ کی توثیق نہ کی جاتی۔

کسی ایک فرد کا ملت سے کٹ جانا کوئی معمولی سانحہ نہیں ہوتا، بادلِ ناخواستہ اس فریضہ کو ادا کیا، اور بتقاضائے احتیاط مزید یہ اہتمام بھی کیا کہ اگر بفرضِ محال کوئی عبارت آپ کی طرف غلط منسوب ہو گئی ہو یا اقتباس ایسا ناقص اور ادھورا ہو کہ اپنے سیاق و سباق میں اس کا مفہوم کچھ بنتا ہو اور جس طرح پیش کیا گیا ہے اس سے کچھ اور مفہوم بن جاتا ہو تو اس پر غور کرنے کا اعلان بھی کر دیا۔

آپ کے خط کے جواب میں اسی بات کا اعادہ کرنے کے علاوہ کیا کر سکتا ہوں کہ "اگر آپ کسی ایسے اقتباس کی نشاندہی کریں جو آپ کی جانب غلط منسوب کیا گیا ہے، یا اقتباس ایسا ناقص اور ادھورا ہے کہ سیاق و سباق سے ہٹ کر کوئی بالکل مختلف مفہوم پیدا کرتا ہے تو اس پر یقیناً غور کیا جائے گا" اور اس کے نتیجہ میں اگر نفسِ فتویٰ پر کوئی اثر پڑتا ہے تو اس امر کی اشاعت بھی ضرور کی جائے گی، نفسِ فتویٰ اور اس کی ذمہ داری سے متعلق تو اتنی ہی بات ہے۔

باقی مسائل جو آپ نے اس مکتوب میں چھیڑے ہیں وہ منجملہ انہی مسائل کے ہیں جو امت کے مسلمہ عقائد سے آپ کا انحراف اور آپ کے معتقدات کا اختلاف واضح کرتے ہیں۔ ایمان، اطاعتِ خدا و رسول و حدیثِ رسول کے متعلق تمام اُمت کے معتقدات اور نصوصِ صریحہ قرآن و سنت کے خلاف تحریف و تلبیس کا مظاہرہ اس میں بھی ہے۔ جہاں تک آپ کے موقف و مسلک کے خلاف دلائل و براہین کا تعلق ہے متعدد اہلِ علم عرصۂ دراز سے وقتاً فوقتاً شرح و بسط کے ساتھ اور مختلف عنوانات سے انہیں پیش کر کے آپ کو متوجہ کرنے کی سعی کرتے رہے ہیں، یہاں تک کہ اس موضوع پر معتدبہ لٹریچر جمع ہو گیا ہے جس سے آپ ناواقف نہ ہوں گے، میری جانب سے ان مسائل پر بحث و مباحثہ اور رد و قدح کا ایک نیا سلسلہ نہ کچھ نتیجہ خیز معلوم ہوتا ہے، نہ میرے قولی اور مشاغل اس کی چنداں اجازت دیتے ہیں۔ اگر ان مسائل پر ہر اعتبار سے ایسے مؤثر اور مدلل انداز میں جو طالبِ حق کے لئے کافی ہونا چاہئے حق کی وضاحت نہ ہو سکی ہوتی تو شاید اپنی تمام معذوریوں کے باوجود اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اپنی بصیرت و بضاعت کی حد تک ان مسائل پر جو آپ نے اس مکتوب میں چھیڑے ہیں ضرور کچھ لکھتا، لیکن نہ اس کی افادیت نظر آتی ہے نہ ضرورت۔

اس لئے یہ خط اس دعا پر ختم کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ پر حق واضح فرما دیں اور اسے قبول کرنے کی توفیق بھی عطا فرما دیں، اور تمام مسلمانوں کو شر و نفس سے مامون اور حق پر قائم رکھیں، واللہ الموفق والمعین۔

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۱۲ مارچ ۱۹۶۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پرویز صاحب کا

جواب

محترم مفتی صاحب! السلام علیکم

گرامی نامہ مورخہ ۱۳ مارچ ۱۹۶۲ء شرفِ صدور لایا۔ تکلیف فرمائی کے لئے شکر گزار ہوں۔

۱۔ آپ نے فتوے کی تمہید میں لکھا تھا کہ

چند مستند معتمد علماء کی ایک جماعت نے پرویزی لٹریچر کو پورے غور سے دیکھا اور پوری احتیاط کے ساتھ اس کے حسبِ ذیل اقتباسات لیئے گئے ہیں۔ (پمفلٹ صفحہ ۱۹)

اب آپ نے اس خط میں جو کچھ لکھا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ مستند اور معتمد علماء کی اس جماعت کی تحقیق ایسی قابلِ اعتماد اور ان کے پیش کردہ اقتباسات اس قدر مکمل تھے کہ انہیں دیکھ کر دیانتاً اس کی گنجائش نہ تھی کہ فتوےٰ کی توثیق نہ کی جاتی۔ میں اس سلسلہ میں صرف ایک مثال پیش کرنا چاہتا ہوں جس سے واضح ہو جائے گا کہ "مستند اور معتمد علماء" کی اس جماعت نے کس قسم کی تحقیق فرمائی۔ جو کچھ انہوں نے پیش کیا اس میں کس قدر دیانت سے کام لیا اور جن حضرات نے اس فتوےٰ کی توثیق فرمائی انہوں نے کتنی ذمہ داری کا ثبوت دیا۔

۲۔ اس فتوےٰ میں مجھے ذاتِ باری تعالیٰ کا منکر ٹھیرایا گیا ہے اور اس کے ثبوت میں حسبِ ذیل اقتباس پیش کیا گیا ہے۔

اور چونکہ خدا عبارت ہے ان صفاتِ عالیہ سے جنہیں انسان اپنے اندر منعکس کرنا چاہتا ہے اس لئے قوانینِ خداوندی کی اطاعت درحقیقت انسان کی اپنی فطرتِ عالیہ کے نوامیس کی اطاعت ہے (پمفلٹ صفحہ ۲۲)

اس اقتباس سے نتیجہ یہ قائم کی گئی ہے کہ میرے نزدیک

اللہ تعالیٰ کا کوئی خارجی وجود نہیں (پمفلٹ صفحہ ۳۳)

اب دیکھئے میرے لٹریچر میں ذاتِ باری تعالیٰ کے متعلق کیا لکھا ہے۔ میں نے اس پچیس تیس برس کے عرصہ میں ذات خداوندی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ ہزارہا صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ متفرق مضامین اور اشارات کے علاوہ میری ایک مستقل تصنیف صرف ذاتِ باری تعالیٰ سے متعلق ہے۔ یہ کتاب سلسلۂ معارف القرآن کی پہلی جلد، اور میری اولین مستقل تصنیف ہے جو آج سے بیس سال پہلے شائع ہوئی تھی۔ پہلے ایڈیشن میں اس کا عنوان ہی "اللہ" تھا۔ جدید ایڈیشن میں اس کا نام "من و یزداں" رکھا گیا ہے۔ یہ بڑے سائز کے قریب ساڑھے چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں پہلے ذاتِ خداوندی کے متعلق قرآن کریم کی تعلیم پیش کی گئی ہے اور اس کے بعد صفاتِ خداوندی (الاسماء الحسنیٰ) میں سے ایک ایک کو نمایاں طور پر سامنے لایا گیا ہے۔ دیکھئے کہ اس کتاب کے ابتدائی صفحات میں ہی اس موضوع پر کیا لکھا ہے۔

> یہ ظاہر ہے کہ جہاں تک خدا کی ذات کا تعلق ہے اس کی کنہ و حقیقت اور ماہیت و کیفیت کا سمجھنا انسانی ذہن کے بس کی بات نہیں۔ ایک محدود ذہن، لامحدود کا تصور کر ہی نہیں سکتا..... یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ذاتِ خداوندی کی کنہ و حقیقت کے متعلق کچھ نہیں کہا۔ صرف یہ بتایا ہے کہ اس کی صفات کیا ہیں۔ قرآنی تعلیم کی عظمت اور بے مثالیت کا بنیادی گوشہ یہ ہے کہ ان صفات کی رو سے خدا کا جو تصور سامنے آتا ہے اس سے بلند، پاکیزہ اور مکمل تصور اور کہیں نہیں مل سکتا۔
>
> (من و یزداں صفحہ ۴ - ۵)

ذرا آگے چل کر لکھا ہے۔

> اللہ کیا ہے؟ اس کی ہستی کیسی ہے؟ اس کی ذات کی کنہ و حقیقت کیا ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب عقلِ انسانی کے احاطہ سے باہر ہے ...... وہ انسان جو ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں کر سکا کہ وہ خود کیا ہے وہ کیا معلوم کر سکے گا کہ خدا کیا ہے۔ وہ شخص جو مشینری کی حقیقت تک پہنچنے سے عاجز ہے، مشینری بنانے والے کی کنہ و حقیقت کا کس طرح احاطہ کر سکتا ہے۔
>
> ذاتِ خداوندی کی ماہیت کا علم انسان کی سرحدِ ادراک سے ماوراء ہے۔
>
> جس چیز کو انسان براہِ راست نہ سمجھ سکے اس کے متعلق اندازہ لگانے کا دوسرا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اس جیسی کسی دوسری شے پر غور کیا جائے۔ لیکن وہ ذات بے مثل و بے نظیر ہے ـــ

(لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ) لہٰذا خدا کی ماہیت انسان کے ذہن میں کیسے آسکتی ہے۔

(من ویزداں صفحہ ۴۴)

اسی کتاب کے صفحہ ۴۹ پر قرآن کریم کی آیات (۲۵۵/۲ ؛ ۲۲-۲۴/۵۹) کو درج کرکے ان کے ترجمہ سے ذات خداوندی کا تعارف ان الفاظ میں کرایا گیا ہے

> اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ زندہ ہے۔ اور اس کی زندگی کے لئے فنا و زوال نہیں القیوم ہے (یعنی ہر شے اس کے حکم سے قائم ہے اور وہ اپنے قیام کے لئے کسی کا محتاج نہیں) نہ (اس کی آنکھ کے لئے) اونگھ ہے نہ (دماغ کے لئے) نیند۔ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے۔ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ غیب و شہادت (حاضر و غائب) کا جاننے والا۔ رحمٰن و رحیم۔ تمام قوتوں کا مالک۔ ہر عیب سے پاکیزہ۔ سلامتی والا۔ امن دینے والا۔ نگہبان۔ غالب۔ بگڑی بنانے والا۔ بڑی عظمت والا۔ وہ لوگوں کے شرک سے پاک ہے۔ اللہ وہ ہے جو پیدا کرنے والا۔ ٹھیک ٹھیک بنانے والا' صورت گر۔ (بہترین ہیئت عطا کرنے والا) سب اچھے اچھے نام (تمام عمدہ صفات) اس کے لئے ہیں۔

اسی کتاب کے صفحہ ۵۰ پر آپ کو یہ عبارت ملے گی۔

> اللہ حقیقی کی جو صفات گذشتہ صفحات میں آپ کے سامنے آئی ہیں ان پر ایک دفعہ پھر نگاہ ڈالئے اور دیکھئے کہ زندگی کا کوئی گوشہ بھی ایسا رہ جاتا ہے جس کے لئے کسی اور "الٰہ" کی تلاش رہے۔ زندگی بخشنے والا' پرورش کرنے والا' رزق دینے والا' امن و سلامتی عطا فرمانے والا' ہر وقت نگہبان بگڑی بنانے والا' ہر معاملہ میں کارساز' وہ جس پر کامل بھروسہ کیا جائے' جسے مایوسیوں میں پکارا جائے۔ جس کے قبضہ میں نفع و نقصان ہو۔ جو حاضر و غائب کا علم رکھتا ہو۔ سب پر غالب' بلندیوں کا مالک' ہر عیب سے منزّہ۔ مالک الملک' شہنشاہ حقیقی (جس کی زندگی کے لئے فنا نہ ہو) جس کے سب محتاج ہوں۔ کیا اس ہستی کے علاوہ کوئی اور ہستی بھی اس قابل ہے کہ اس کی عبودیت اختیار کی جائے۔

یہ کتاب کی ابتدا تھی۔ اس کے آخری صفحات میں آپ کو یہ عبارت ملے گی۔

> جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے' اللہ کی ذات کی معرفت انسانی حیطۂ ادراک سے ماوراء ہے۔ اس لئے انسان کو اپنے متعلق جس قدر علم دینا چاہا وہ ان صفات کے ذریعے دے دیا جو قرآن کریم

میں مذکور ہیں۔ اس لئے ہم اللہ کے متعلق جو کچھ بھی جان سکتے ہیں، وہ اتنا ہی ہے جتنا قرآن بیان کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی ذریعہ ایسا نہیں جس سے ہم خدا کی ذات کو پہچان سکیں یا اس کے متعلق علم حاصل کر سکیں۔ یہی ایک عبد مومن کے لئے علم کا آخری نقطہ اور معرفت کی آخری حد ہے۔ اس سے آگے نہ بڑھا جا سکتا ہے نہ بڑھنے کی کوشش نتیجہ خیز ہو سکتی ہے۔ اسلام ایک سیدھا سادا صاف و شفاف نصاب تعلیم و ضابطۂ عمل ہے۔ اس میں نہ بے مقصد فلسفیانہ نکتہ آفرینیاں ہیں نہ بے مطلب عالم خیال کی قیاس آرائیاں۔ اسلام سے مفہوم یہ ہے کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل شدہ قرآن کے مطابق خدا پر ایمان، فکر و نظر کے تمام گوشوں کا مرکز ہو۔ اور امکانی حدود کے اندر صفات خداوندی کا اپنے اندر منعکس کرتے جانا اعمال حیات کے تمام شعبوں کا محور۔ (صفحہ ۴۴)

۳۔۔۔۔ فتوے میں کہا گیا ہے کہ میں "موجود فی الخارج" خدا کا قائل نہیں ہوں۔ جو اقتباسات اوپر دیئے گئے ہیں وہ بھی اس الزام کی تردید کے لئے کم نہیں۔ لیکن اس خاص نقطہ کے متعلق میری کتاب "سلیم کے نام خطوط" میں جو کچھ کہا گیا ہے اسے بھی آپ کی معلومات کے لئے درج کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ اس میں لکھا ہے۔

لیکن دین (قرآن) خدا کے متعلق ایک جداگانہ تصور عطا کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا ذہن انسانی کا تراشیدہ نہیں بلکہ وہ خارج میں موجود ہے۔ وہ اس وقت بھی موجود تھا جب کوئی تصور کرنے والا ذہن موجود نہیں تھا۔ اور اس وقت بھی موجود ہوگا جب کوئی تصور کرنے ذہن موجود نہیں ہوگا۔ وہ موجود ہے اور اپنی خصوصیات کے ساتھ موجود ہے۔ اس کی یہ خصوصیات (جنہیں صفات کہا جاتا ہے) مستقل بالذات اور موجود فی الخارج ہیں۔

(جلد دوم صفحہ ۷-۸)

اور اسی خط کے آخر میں کہا گیا ہے

یہ ہے سلیم! وہ خدا جس پر ایمان لانے کا مطالبہ قرآن کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ مختصر الفاظ میں اس حقیقت کو پھر دہرا لو کہ خدا کسی انسان کے ذہن کی تخلیق نہیں بلکہ ایک موجود فی الخارج ذات ہے جسے حقیقت مطلقہ کہا جاتا ہے۔ اس خدا کا تعارف ان صفات کی رو سے ہوتا ہے جو اس نے خود وحی کے ذریعے بیان کر دی ہیں۔ (ایضاً صفحہ ۳۶)

میں پوچھنا چاہتا ہوں "مستند اور معتمد علماء" کی اس جماعت سے جس نے میرے لٹریچر کو، پورے غور سے دیکھا

اور پوری پوری احتیاط کے ساتھ اس کے اقتباسات پیش کئے" کہ انہیں میرے لٹریچر میں مندرجہ بالا عبارات کہیں دکھائی نہیں دیں؟ (اور اگر دکھائی نہیں دیں تو کیوں؟) - اور میں پوچھنا چاہتا ہوں آپ حضرات سے جنہوں نے اس فتویٰ کی توثیق فرمادی کہ جس شخص کا عقیدہ وہ ہو جو مندرجہ بالا عبارات سے روز روشن کی طرح واضح ہے کیا اس کے متعلق یہ کہا جائے گا کہ وہ موجود فی الخارج خدا کی ذات کا منکر ہے؟ اور جو لوگ یہ سب کچھ جانتے بوجھتے اس کے متعلق یہ کہیں، ان کے بارے میں آپ کا کیا فتویٰ ہے؟

۴۔ انسان کے لئے کیوں ضروری ہے کہ وہ خدا پر ایمان رکھے۔ اس سلسلہ میں میں نے (من جملہ دیگراں) لکھا ہے کہ

> انسان صرف جسم کا نام نہیں۔ جسم کے علاوہ اس کے پاس ایک اور شے بھی ہے جسے انسانی ذات کہتے ہیں۔ انسانی ذات کی اگر مناسب نشوونما ہو جائے تو اس میں حدِ بشریت کے اندر وہ صفات اجاگر ہوتی چلی جاتی ہیں جنہیں خدا کے ضمن میں اسماء الحسنیٰ کہا جاتا ہے۔ اس طرح کی نشوونما یافتہ ذات حیاتِ جاوید حاصل کر لیتی ہے اور جسم کی موت سے اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ (ان میں وہ صفاتِ خداوندی شامل نہیں جن کا تعلق خدا کی لامتناہیت سے ہے) قرآن نے صفاتِ خداوندی کو اس تفصیل اور وضاحت اور حسن و خوبی کے ساتھ اسی لئے بیان کیا ہے کہ انسان انہیں اپنی ذات کی نشوونما کے لئے بطور معیار اپنے سامنے رکھے۔ جوں جوں انسانی ذات میں ان صفات کی نمود ہوتی جاتی ہے وہ (قرآن کے الفاظ میں) "خدا کے رنگ میں رنگا جاتا ہے"؛ یا اس کا قرب حاصل کرتا جاتا ہے۔
>
> خدا کی صفات کو اپنے سامنے بطور معیار رکھ لینا اور اپنی ذات میں ان کی نمود کو زندگی کا نصب العین قرار دے لینا ایمان باللہ (خدا پر ایمان) کہلاتا ہے۔

(من و یزداں صفحہ ۷۰، ۱۸ و ۷۴۴)۔

ان تصریحات کی روشنی میں اس فقرے کو دیکھئے جسے "علماء کی کمیٹی" نے پیش کر کے مجھے خدا کا منکر ٹھہرایا ہے۔ میں نے اسلامی مملکت کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> اس نظریۂ حیات اور تصورِ مملکت کی بنیاد اس آفاقی اصول پر ہے کہ قانون سازی کا حق کسی انسان کو نہیں۔ انسانوں کے لئے اصولی قوانین اور اساسی آئین صرف ذاتِ خداوندی متعین کر سکتی ہے۔ اس لئے اس نظامِ مملکت میں حاکمیت کا اقتدارِ اعلیٰ صرف خدا کو حاصل ہے"

اور چونکہ خدا عبارت ہے ان صفات عالیہ سے جنہیں انسان اپنے اندر منعکس کرنا چاہتا ہے اس لئے قوانین خداوندی کی اطاعت درحقیقت انسان کی اپنی فطرتِ عالیہ کے نوامیس کی اطاعت ہے۔ کسی غیر کی محکومیت نہیں۔ فلہٰذا اس مملکت میں انسان کسی غیر کا محکوم اور غلام نہیں ہوتا بلکہ اس حریت و آزادی کا زندہ پیکر ہوتا ہے جو اس کی فطرتِ صحیحہ کا تقاضا ہے۔

(معراج انسانیت صفحہ ۴۲۰)

اس باریک نکتہ کی وضاحت "من و یزداں" میں ان الفاظ سے کی گئی ہے۔

بجز ان صفات کے جن کا تعلق خالصۃً خدا کی لامتناہیت اور لامحدودیت سے ہے (مثلاً یہ کہ اُسے کسی نے پیدا نہیں کیا۔ نہ ہی وہ عدم سے وجود میں آیا ہے) انسانی ذات کی بنیادی صفات وہی ہیں جو صفات، ذات خداوندی کی ہیں، اس فرق کے ساتھ کہ انسانی ذات کی یہ صفات محدود اور مٹی ہوئی شکل میں ہوتی ہیں، نیز قابل نشوونما۔ ان کی نشوونما اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ انسان صفاتِ خداوندی کو اپنے سامنے بطور معیار رکھے۔ یہ انسان اور خدا کا بنیادی تعلق ہے۔ جس چیز کو قوانین خداوندی کی اطاعت کہتے ہیں وہ (معاذ اللہ) کسی مستبد، مطلق العنان ڈکٹیٹر کے احکام کی فرماں پذیری نہیں ہوتی بلکہ ان ہدایات کا اتباع ہوتا ہے جن سے انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ اِن ہدایات کے اِتباع سے اس کی ذات کے تقاضوں کی تسکین ہوتی ہے۔

(من و یزداں، صفحہ ۱۴)

علامہ اقبالؒ نے اسی بلند حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

اسلام خدا کی اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے، تخت و تاج کی اطاعت کا نہیں۔ اور چونکہ خدا زندگی کی آخری اساس ہے۔ اس لئے خدا کی اطاعت درحقیقت انسان کی اپنی مثالی فطرت کی اطاعت کے مرادف ہے[1]

(خطبات اقبال انگریزی۔ صفحہ ۱۴۰)

---

[1] خدا کرے کہ کوئی صاحب اقبالؒ پر بھی یہ کہہ کر کفر کا فتویٰ نہ لگا دیں کہ خدا زندگی کا خالق ہے، زندگی کی اساس نہیں۔ ویسے سنا ہے کہ فتویٰ ان پر بھی لگا تھا۔

۵۔ میں انہی اقتباسات کو کافی سمجھتا ہوں ورنہ، جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے، ذات خداوندی کے متعلق میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ہزاروں صفحات میں بکھرا پڑا ہے۔ آپ ان تشریحات سے بخوبی اندازہ فرما سکیں گے کہ علماء کی کمیٹی نے میرے لٹریچر سے اقتباسات پیش کرنے میں کس "احتیاط اور دیانت" سے کام لیا ہے اور جن حضرات نے اس فتویٰ کی توثیق فرمائی ہے، انہوں نے کس قدر ذمے داری کا ثبوت دیا ہے۔ اس ایک مثال سے آپ کمیٹی کی باقی تحقیق کا بھی بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔

۶۔ آپ نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ اگر آپ کسی ایسے اقتباس کی نشان دہی کر دیں جو آپ کی جانب غلط منسوب کیا گیا ہے، یا اقتباس ایسا ناقص اور ادھورا ہے کہ سیاق و سباق سے ہٹ کر کوئی بالکل مختلف مفہوم پیدا کرتا ہے..... یا کوئی ایسی شاذ عبارت ہو جو آپ کی کثیر التعداد تصانیف و مقالات میں پیش کردہ مسلک سے بالکل میل نہ کھاتی ہو۔ تو اس پر یقیناً غور کیا جائے گا اور اس کے نتیجے میں اگر نفس فتویٰ پر کوئی اثر پڑتا ہے تو اس امر کی اشاعت بھی ضرور کی جائے گی۔"

میں نے اپنی تحریروں کے جو اقتباسات اس خط میں پیش کئے ہیں مجھے امید ہے کہ ان کی روشنی میں آپ مجھ سے متفق ہوں گے کہ آپ پر یہ فریضہ عائد ہو جاتا ہے کہ آپ اس کا اعلان فرمائیں اور اس اعلان کی عام اشاعت کریں کہ کم از کم اس حد تک علماء کی کمیٹی نے میرے خیالات پیش کرنے میں احتیاط اور دیانت سے کام نہیں لیا اور یہ کہ فتویٰ کی یہ شق باطل اور گمراہ کن ہے۔ اگر آپ نے ایسا کر دیا تو میں عندالضرورت اس کمیٹی کی تحقیقات کے باقی حصوں کی بھی اسی طرح نقاب کشائی کر دوں گا۔ وہیں سے یہ حقیقت بھی آپ پر روشن ہو جائے گی کہ میرے معتقدات و نظریات کے خلاف (بقول آپ کے) "متعدد اہل علم عرصہ دراز سے وقتاً فوقتاً شرح و بسط کے ساتھ جو کچھ کہتے چلے آ رہے ہیں" اس میں حقیقت کس قدر ہے اور خالص پروپیگنڈہ کس قدر۔

۷۔ اس ضمن میں اتنا واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں یہ خط و کتابت اس لئے نہیں کر رہا کہ میرے نزدیک اس قسم کے فتووں سے واقعی ایک مسلمان کافر ہو جاتا ہے اور اس کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ اپنے ایمان کا ثبوت پیش کرے۔ میں تو ایک طرف رہا، اس بات کے تو خود آپ بھی قائل نہیں کہ ان فتووں سے ایک مسلمان واقعی کافر ہو جاتا ہے۔ مثلاً آپ اپنی ہی مثال لیجئے۔ آپ دیوبندی مکتب خیال سے متعلق ہیں، اور آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ دیوبندی حضرات پر کفر کے متعدد فتوے لگ چکے ہیں۔ اس کے باوجود آپ نے کبھی اپنے آپ کو کافر نہیں سمجھا۔ یا جن علماء نے اس فتوے پر دستخط کئے ہیں وہ جن فرقوں سے متعلق ہیں، ان میں سے کون فرقہ ایسا ہے جس پر کفر کے فتوے نہیں لگ چکے لیکن اس کے باوجود وہ سب مسلمان کے مسلمان ہیں۔ سو ظاہر ہے کہ جب دوسروں کے

فتووں سے یہ حضرات کافر نہیں ہوئے، تو ان کے فتووں سے دوسرا کافر کس طرح ہو جائے گا! میں نے یہ خط و کتابت محض اس لئے کی ہے کہ آپ حضرات نے اپنی غیر ذمہ داری سے (جس کا ثبوت اوپر پیش کیا جا چکا ہے) ہزاروں سادہ لوح مسلمانوں کو، دوسرے مسلمانوں سے بدظن کر دیا ہے اور اس قسم کی بدظنی قرآن کریم کی رُو سے اثم (گناہ) قرار پاتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ سادہ لوح مسلمان اس گناہ سے بچ جائیں، اور آپ میں سے بھی جن حضرات کو اللہ توفیق عطا فرمائے وہ اپنے اس اقدام سے نادم ہو کر خدا کے حضور تائب ہو سکیں۔

۸۔۔۔ اگر آپ ایک مخلصانہ مشورہ پر غور کرنے کے لئے تیار ہوں تو میں عرض کروں گا کہ اگر آپ فتاویٰ صادر کرنے کی اہم ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائیں تو آپ کے لئے بہت اچھا ہوگا۔ اس لئے کہ اس قسم کے فیصلے دینے کے لئے جس قسم کی تحقیق اور کاوش کی ضرورت ہوتی ہے وہ (معاف فرمائیے) آپ کے بس کی بات نہیں۔ اور دوسروں کی تحقیق جس قدر قابلِ اعتماد ہوتی ہے اس کا نمونہ آپ اوپر دیکھ چکے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ تقسیم سے پہلے آپ نے یہ فتویٰ دیا تھا کہ عبادات کے لئے لاؤڈ اسپیکر کا استعمال ناجائز ہے۔ اس فیصلہ تک پہنچنے کے لئے آپ نے لکھا تھا کہ "آپ نے اس کے متعلق الیگزنڈرہائی سکول بھوپال کے سائنس ماسٹر برج نندن لال صاحب سے دریافت کیا تھا اور انہوں نے کہا تھا کہ "برقی قوت کی وجہ سے میں تو کم از کم یہ ماننے میں تامل کرتا ہوں کہ اصل آواز ہے۔ اور اسکا انکار بھی مجھ سے ممکن نہیں کہ ثبوت مشکل ہے"۔" اس تحقیق" کی بنا پر آپ نے لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کو شرعاً ناجائز قرار دے دیا تھا۔ اب اسی لاؤڈ اسپیکر کو آپ سمیت تمام علمائے کرام بلا تامل استعمال کرتے ہیں۔

یہ تو عام مسائل کے متعلق فتویٰ کا ذکر ہے۔ جہاں تک کسی مسلمان کو کافر قرار دینے کا تعلق ہے وہ (آپ کے الفاظ میں)، "کوئی معمولی سانحہ نہیں ہوتا"۔ میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا کہ کسی فرد کو اس کا حق بھی حاصل ہے یا نہیں کہ وہ کسی مسلمان کے کفر و ایمان کا فیصلہ کرے۔ لیکن اگر کوئی شخص اسے اپنا حق سمجھتا بھی ہے تو اس کے لئے جس احتیاط اور دیانت کی ضرورت ہے، وہ بالکل عیاں ہے۔ اور جب اس قسم کی تحقیق و کاوش آپ کے بس کی بات نہیں، تو آپ کیوں اتنا بڑا بوجھ ناحق اپنی گردن پر لاد کر خدا کے حضور جائیں! میں سمجھتا ہوں کہ خدا یہ تو شاید پوچھے کہ تم نے کتنے کافروں کو مسلمان بنایا تھا لیکن وہ یہ نہیں پوچھے گا کہ تم نے کتنے مسلمانوں کو کافر بنایا تھا!

۹۔۔۔ اس تکفیر و تفسیق سے اُمت کو کس قدر نقصان پہنچا ہے، اسے تو چھوڑیئے۔ اس سے خود آپ حضرات کی پوزیشن کیا ہو گئی ہے اس کے متعلق آپ مجھ سے نہیں خود اپنوں میں سے ہی ایک کی زبان سے سنیئے۔ سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب اس ضمن میں لکھتے ہیں:-

افسوس ہے کہ مدتوں کی چلی ہوئی اس روش کو چھوڑنے پر ہمارے علمائے کرام کسی طرح راضی نہیں ہوتے۔ انہوں نے

اصل اور فرع، نص اور تاویل کے فرق کو نظر انداز کر دیا ہے۔ وہ ان فروع کو بھی اصول بنائے بیٹھے ہیں جن کو انہوں نے خود یا ان کے اسلاف نے اپنے مخصوص فہم کی بنا پر اصول سے اخذ کیا ہے۔ وہ ان تاویلات کو بھی نصوص کے درجے میں رکھتے ہیں جو نصوص سے معانی اخذ کرنے میں ان کے گروہ نے اختیار کی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنے فروع اور اپنی تاویلات کے منکر کو بھی اسی طرح کا فرقرار دیتے ہیں جس طرح اصول اور نصوص کے منکر کو قرار دیا جاتا ہے۔ اس کھینچ تان اور بے اعتدالی نے پہلے تو اسلامی جمعیت میں صرف تفرقہ ہی پیدا کیا تھا مگر اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ علماء کی یہ کافر گری مسلمانوں کے دلوں میں نہ صرف علماء کی طرف سے بلکہ خود اس مذہب کی طرف سے بھی بدگمانیاں پیدا کر رہی ہے جس کی نمائندگی یہ علماء کرتے ہیں۔ روز بروز علماء کا اقتدار مسلمانوں پر سے اٹھتا جا رہا ہے۔ ان کی باتیں سن کر دل مذہب کی طرف راغب ہونے کے بجائے اس سے دور بھاگنے لگے ہیں۔ مذہبی مجلسوں اور مذہبی تحریروں کے متعلق یہ عام خیال پیدا ہو گیا ہے کہ ان میں فضول جھگڑوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اس غلبۂ کفر و فسق کے زمانے میں عام مسلمانوں کو مذہبی علوم کی واقفیت بہم پہنچانے کا اگر کوئی ذریعہ ہو سکتا تھا تو وہ یہ تھا کہ علمائے دین پر لوگوں کو اعتماد ہوتا اور وہ ان کی تحریروں اور تقریروں سے فائدہ اٹھاتے۔ مگر افسوس کہ ان فرقہ بندی کی لڑائیوں اور ان تکفیر کے مشغلوں سے یہ ایک ذریعہ بھی ختم ہوا جا رہا ہے اور یہ مسلمانوں میں مذہب سے عام ناواقفیت اور گمراہی کے پھیلنے کی ایک بڑی وجہ ہے۔ کاش ہمارے علماء اپنی اس غلطی کو محسوس کریں اور اسلام اور مسلمانوں پر نہیں تو خود اپنے اوپر ہی رحم کر کے اس روش سے باز آجائیں جس نے ان کو اپنی قوم میں اس قدر رسوا کر دیا ہے درانحالیکہ یہی وہ قوم تھی جو کبھی ان کو سر آنکھوں پر بٹھاتی تھی۔ (تفہیمات۔ حصہ دوم۔ صفحہ ۱۵۲)

۱۰۔ میں حسب سابق اس خط و کتابت کو بھی اشاعت کے لئے پریس میں بھیج رہا ہوں۔ اللہ ہم سب کو صحیح راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ والسلام

خیر طلب
پرویز
۲۵۔ مارچ ۱۹۶۲ء

۲۵۔ بی گل برگ
لاہور

طلوعِ اسلام کا مسلک

۱۔ قرآن کریم، تمام نوعِ انسان کے لئے، خدا کی طرف سے راہ نمائی کا آخری ضابطۂ حیات ہے، اور نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) خدا کے آخری نبی اور رسول۔

۲۔۔۔۔ نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ، تمام نوعِ انسان کے لئے، بلندیٔ اخلاق و کردار کا بہترین نمونہ (اسوۂ حسنہ) ہے جس کے اتباع میں شرفِ انسانیت کا راز پنہاں ہے۔

۳۔۔۔۔ احادیث کے مجموعوں میں صحیح حدیثیں بھی ہیں اور وضعی بھی۔ جو روایت قرآن کریم کے خلاف ہو یا جس سے نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ پر کسی قسم کا حرف آتا ہو، وہ صحیح نہیں ہو سکتی۔

۴۔۔۔۔ اُمت کے مختلف فرقے، اسلامی ارکان کو جس طرح ادا کرتے چلے آرہے ہیں، ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کرنے، یا کوئی نیا طریقہ ایجاد کرنے کا کسی کو حق نہیں۔ اگر کسی وقت، خلافت علیٰ منہاجِ نبوت کا دوبارہ قیام ہو جائے، اور وہ اُمت میں پھر سے وہی وحدت پیدا کرنے کے لئے، جو ابتدائے اسلام میں تھی، ان کے لئے کوئی ایک طریقہ متعین کر دے تو اس سے امت کا موجودہ اختلاف و انتشار ختم ہو جائے گا۔

۵۔۔۔۔ خلافت علیٰ منہاجِ نبوت کا دوبارہ قیام ممکن ہے۔ جب کوئی مملکت اپنے آپ کو قوانینِ خداوندی کا پابند قرار دے لے، اور اس کے چلانے والے سیرتِ محمدیہ کے قالب میں ڈھلے ہوں، تو اسے خلافت علیٰ منہاجِ نبوت کہا جائے گا۔ اس کی سنٹرل اتھارٹی کو "مرکزِ ملت" کی اصطلاح سے پکارا جاتا ہے۔ اُس وقت امت پھر اسی طرح اسلام کے راستے پر چل سکے گی جس طرح خلافتِ راشدہ کے زمانے میں چلتی تھی۔ اس نظام میں تمام مسلمانوں کے لئے ایک ہی قانون ہو گا اور ایک ہی منہاج۔ اس طرح امت میں پھر سے وحدت پیدا ہو جائے گی۔ جب کسی معاملہ میں اختلاف ہو گا تو اس کا فیصلہ بابِ خلافت سے صادر ہو گا۔

۶۔۔۔۔ خلافتِ علیٰ منہاجِ نبوت کا ایک فریضہ یہ بھی ہو گا کہ وہ دیکھے کہ ملک کا کوئی باشندہ بنیادی ضروریات

زندگی سے محروم نہ رہ جائے، اور ان کی مضمرانسانی صلاحیتوں کی نشوونما کا پورا پورا انتظام ہو۔ ظاہر ہے کہ مملکت اس عظیم ذمہ داری سے اسی صورت میں عہدہ برآ ہو سکتی ہے جب رزق کے سرچشموں پر اُسے اقتدار حاصل ہو۔ اسے نظامِ ربوبیت کہا جاتا ہے۔ اور یہی نظام کمیونزم کے اُس سیلاب کی روک تھام کر سکتا ہے جو اس وقت ساری دنیا کے لئے بالعموم اور عالمِ اسلامی کے لئے بالخصوص سب سے بڑا خطرہ ہے۔ کمیونزم، خدا۔ رسول وحی۔ آخرت، سب کی منکر (بلکہ دشمن) ہے اور صرف "روٹی کے مسئلہ" کو انسانی زندگی کا منتہیٰ قرار دیتی ہے۔ اس لئے یہ اسلام کی ضد اور سب سے بڑی حریف ہے۔ طلوعِ اسلام، کمیونزم کی مخالفت، اور قرآنی نظامِ ربوبیت کے قیام کی دعوت دیتا ہے۔

۷ ــــ طلوعِ اسلام کا مسلک ہنگامے برپا کرنا نہیں، بلکہ علم و بصیرت اور دلائل و براہین کی رُو سے قرآن کریم کی تعلیم کو اس طرح پیش کرنا ہے جس سے قلب و دماغ میں صحیح تبدیلی پیدا ہو جائے۔ اس لئے اس کا اوّلین مخاطب قوم کا تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ ہے، جس کی اصلاح سے قوم کی اصلاح ہو جاتی ہے۔

۸ ــــ طلوعِ اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ مذہبی فرقہ سے۔ نہ عملی سیاست میں حصّہ لینا اس کے پروگرام میں ہے پاکستان کا استحکام۔ ملت کی وحدت اور قرآن کریم کی تعلیم کی روشنی میں، قوم کے قلب و نگاہ میں تبدیلی پیدا کر کے، صحیح اسلامی معاشرہ کا قیام اس کا نصب العین ہے۔

صحیح اسلام

سمجھنے کے لئے پرویز صاحب کا لٹریچر دیکھئے۔

اس کی تفصیل کے لئے آپ ایک کارڈ ذیل کے پتہ پر بھیج دیجئے۔

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ

۲۷۔ بی ــــ شاہ عالم مارکیٹ ــــ لاہور

حقائق و عبر

نہایت اہم سوال

سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کے درسِ قرآن میں ایک صاحب نے سوال کیا کہ تراویح کی تعداد کیا ہے بعض کہتے ہیں آٹھ سنت ہے اور بیس بدعت ہے۔ اور بعض بیس پر اصرار کرتے ہیں اور آٹھ والوں کی مذمت کرتے ہیں۔

اس کا جواب انھوں نے حسبِ ذیل دیا۔ (یہ سوال اور جواب' ہفتہ دار ایشیا کی ، ۱۸ مارچ کی اشاعت میں شائع ہوئے ہیں)۔

جواب:- تراویح کی تعداد ایک ایسا مسئلہ ہے جسے برسوں سے گھسا جا رہا ہے۔ مگر اسے جتنا گھستے ہیں اتنا ہی موٹا ہوتا جا رہا ہے۔ جو لوگ بیس کو بدعت بتاتے ہیں ان کو سوچنا چاہیئے کہ یہ تعداد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جاری کی تھی اور تمام صحابہ نے اس پر اتفاق کیا۔ صحابہ ایسے لوگ نہیں تھے کہ حضرت عمرؓ کے ڈنڈے سے ڈر کر بیس رکعت پر اتفاق کر لیتے اور نہ حضرت عمرؓ ایسے تھے کہ بدعات جاری کرتے۔ پھر اگر بفرضِ محال حضرت عمرؓ کی وجہ سے بیس پڑھی جانے لگی تھیں تو ان کے بعد کس بات کا اندیشہ تھا کہ حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت معاویہؓ اور ان کے بعد یہ دستور جاری رہا۔ اور جو لوگ آٹھ رکعت کی مخالفت کرتے ہیں، وہ اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آٹھ رکعت ہی تراویح پڑھی ہیں۔ اس لئے اس تعداد کی مخالفت کرنے والے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کی مذمت کرتے ہیں۔ صحیح چیز یہ ہے کہ دونوں صورتیں درست ہیں جس شخص کا جس تعداد پر اطمینان ہو وہ اتنی پڑھے، اور جھگڑا نہ کرے اور نہ دوسرے کی مذمت کرے۔

اس سے چند ایک سوالات پیدا ہوتے ہیں جو نہایت اہم اور غور طلب ہیں۔ مثلاً

(۱) یہ کہا جاتا ہے (اور مودودی صاحب کا بھی یہ عقیدہ ہے) کہ نبی اکرم کے اس قسم کے فیصلے وحی کی رو سے ہوتے تھے۔ اور یہ بھی کہ حضرت عمرؓ پر وحی نہیں آتی تھی۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا وحی کا فیصلہ کوئی شخص اپنے ذاتی اجتہاد یا رائے سے بدل سکتا ہے؟ اگر نہیں بدل سکتا تو پھر حضرت عمرؓ نے آٹھ کی جگہ بیس رکعت کس طرح رائج کر دیں اور صحابہؓ نے ان کے اس فیصلے کو کس طرح قبول کر لیا؟

(۲) جواب میں کہا گیا ہے کہ "آٹھ کی تعداد کی مخالفت کرنے والے نبیؐ کے طریقے کی مذمت کرتے ہیں"۔ آٹھ کی مخالفت سب سے پہلے (مودودی صاحب) کے جواب کے مطابق) حضرت عمرؓ نے کی اور اس کی تائید دیگر صحابہؓ نے بھی فرمائی؟ کیا یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ان حضرات نے رسول اللہ کے طریقے کی (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) مذمت فرمائی تھی؟

(۳) جب مودودی صاحب کے بیان کے مطابق) یہ ثابت ہے کہ نبی اکرم نے آٹھ رکعت پڑھی تھیں، تو کیا آٹھ کی بجائے بیس رکعت رائج کرنا (معاذ اللہ) معصیت رسول اللہ نہیں؟ کیا اسے تسلیم کر لیا جائے کہ ایسے جلیل القدر صحابی اس کے مرتکب ہوئے تھے!

(۴) جب یہ تسلیم ہے کہ حضرت عمرؓ کا یہ عمل بالکل درست تھا تو کیا اس سے صاف ظاہر نہیں کہ خلافت علیٰ منہاج نبوت رسول اللہ کے فیصلوں میں تبدیلی کرنے کی مجاز ہے؟

(۵) جواب میں کہا گیا ہے کہ "صحیح چیز یہ ہے کہ یہ دونوں صورتیں درست ہیں جس شخص کا جس تعداد پر اطمینان ہو وہ اتنی پڑھ لے اور جھگڑا نہ کرے۔ اور نہ دوسرے کی مذمت کرے"۔ انفرادی طور پر تو یہ مشورہ بڑا صلح کل اور قابل عمل ہے لیکن اگر اسی بات کو ملک کا قانون بننا ہو تو پھر ان دونوں صورتوں میں سے ایک ہی صورت اختیار کی جا سکے گی۔ سوال یہ ہے کہ اس وقت ان میں سے کون سی صورت "کتاب و سنت" کے مطابق تصور کی جائے گی۔ اگر (مودودی صاحب کی تجویز کے مطابق، ملک کا قانون، ملک کی اکثریت کے مسلک کے مطابق ہو گا تو) بیس رکعت کا طریق اختیار کیا جائے گا۔ کیا یہ قانون، سنتِ رسول اللہ کے خلاف نہیں ہو گا؟

واضح رہے کہ یہ مشکل (کہ رسول اللہ کا عمل کچھ اور تھا، اور خلافت راشدہ میں کچھ اور طریق اختیار کر لیا گیا) تراویح کی رکعت تک ہی محدود نہیں۔ اس کی ایسی مثالیں بھی موجود ہیں جن کا تعلق معاشرتی قوانین سے ہے۔ مثلاً رسول اللہ کے زمانے میں ایک نشست میں دی ہوئی تین طلاق کو ایک شمار کیا جاتا تھا اور حضرت عمرؓ نے انھیں تین قرار دیدیا تھا۔ امت کے دو گروہوں میں سے ایک گروہ (اہلِ حدیث حضرات) کا عمل اس فیصلے کے مطابق ہے جسے نبی اکرم کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور دوسرے گروہ (حنفی حضرات) کا عمل حضرت عمرؓ کے فیصلے کے مطابق ہے۔ اگر ملک کا قانون اکثریت (حنفی

حضرات) کے مسلک کے مطابق مرتب ہوگا اور آپ سے "کتاب سنت" کے مطابق قانون قرار دیا جائے گا تو کیا اہل حدیث حضرات اس "قانون" کو "کتاب وسنت" کے مطابق تسلیم کریں گے ؟

(۴) تراویح کی رکعت کے اختلافات کے معاملہ میں مودودی صاحب نے فرمایا ہے کہ دونوں طریقے صحیح ہیں اس لئے جس کا جس تعداد پر اطمینان ہو وہ اتنی پڑھے لیکن جب بعینہٖ یہی شکل طلاق کے معاملہ میں سامنے آئی تو اس کے متعلق مودودی صاحب نے ارشاد فرمایا کہ

> آئمہ اربعہ اور جمہور فقہا کا مسلک یہ ہے کہ تین طلاق اگر ایک وقت میں دیئے جائیں تو وہ تین ہی طلاق شمار ہوں گے۔ اور میرے نزدیک یہی صحیح تر ہے۔ اس لئے میں مشورہ نہیں دے سکتا کہ اس قاعدے میں کوئی تغیر کیا جائے لیکن یہ امر مسلم ہے کہ ایسا کرنا گناہ ہے کیونکہ یہ اس طریقے کے خلاف ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے طلاق دینے کے لئے سکھایا ہے اس لئے اس غلط طریقے کی روک تھام ضروری ہونی چاہیئے۔

آپ نے غور فرمایا کہ ان حضرات کے ذہنوں میں اس قسم کے چھوٹے چھوٹے مسائل کے متعلق بھی کس قدر الجھاؤ ہے؟ اب سوچئے کہ جب اس الجھاؤ میں گرفتار ذہن ——— اور وہ بھی مختلف فرقوں سے متعلق ——— ملک کا قانون بنانے بیٹھیں گے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اس نتیجہ کو دیکھنے کے لئے اب ملک کو زیادہ عرصہ تک انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ دو چار ماہ کے بعد جب پارلیمان "قانون سازی" کا فریضہ سرانجام دینے لگے گی اور ان حضرات سے (جو اس وقت اسلامک ایڈوائزری کونسل کے اراکین ہوں گے) دریافت کیا جائے گا کہ مجوزہ قانون اسلام کے مطابق ہے یا نہیں تو نتیجہ سامنے آجائے گا۔ اس وقت کفر کے فتووں سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ اس وقت تمام فرقوں کے علماء حضرات کو متفق علیہ فیصلہ دینا ہوگا۔ اور ایسا ہونا ناممکن ہے۔ لہٰذا جب صورت حالات یہاں تک پہنچ جائیگی تو اس وقت اسکے سوا چارہ نہیں ہوگا کہ یا تو اسلام دوست عنصر کو اس راستے کو اختیار کرنا پڑے جس کی طرف یہ کافر اتنے عرصے سے دعوت دیتے چلے آرہے ہیں ——— یعنی یہ کہ قرآن کریم کو، جو تمام مسلمانوں کے نزدیک قدر مشترک ہے قانون کی بنیاد تسلیم کیا جائے ——— اور یا اُن لوگوں کی بات مان لی جائے جو سیکولر انداز حکومت کا جذبہ دلوں میں لئے بیٹھے ہیں ——— یعنی مذہب کو عبادات' یا وہ سے زیادہ پرسنل لاز تک محدود رکھا جائے اور ملکی قانون سیکولر طریق سے مرتب کر لیا جائے۔ ہمارے مذہب پرست طبقہ کے نزدیک یہ شکل تو قابل قبول ہوگی (کیونکہ انھوں نے ان لوگوں کے خلاف کفر کے فتوے کبھی عائد نہیں کئے جو سیکولر انداز حکومت چاہتے ہوں) لیکن قرآن کو قانون کی بنیاد تسلیم کرنے کے لئے کبھی تیار نہیں ہوں گے (کیونکہ ان کے نزدیک یہ کفر ہے)۔

چنیں دور آسماں کم دیدہ باشد

(دورِ منشور کا باقی مضمون)

کی تعلیم دیتا ہے۔ (پروفیسر نکلسن کے نام خط۔ متعلقہ فلسفہ سخت کوشی)

نسل اور حدودِ ملک کی بنیاد پر قبائل اور اقوام کی تنظیم حیاتِ اجتماعی کی ترقی اور تربیت کا ایک وقتی اور عارضی پہلو ہے۔ اگر اسے یہی حیثیت دی جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن میں اس چیز کا مخالف ہوں کہ اسے انسانی قوتِ عمل کا مظہرِ اتم قرار دیا جائے۔ (پروفیسر نکلسن کے نام خط۔ متعلقہ فلسفہ سخت کوشی)

جس جہانِ نو کا

تصور ہمارے زمانے میں علامہ اقبال نے پیش کیا اس کے خدوخال کو سامنے لانے کیلئے ضروری ہے کہ آپ اس مجموعہ کو دیکھیں جس میں

اقبال

اور

قرآن

بیک وقت آپ کے سامنے آ جائے، قرآن کے حقائق اور اقبال کا بیان جن حقائق کا اس سے زیادہ دلکش مرقع اور کون سا ہو سکتا ہے۔ اس سے قبل اقبال پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن جو نذیر رضا کی گرانمایہ تصنیف

"اقبال اور قرآن"

سے جو کچھ آپ کے سامنے آئے گا اس سے پہلے آپ نے کہیں نہیں دیکھا ہوگا ــــــ قیمت دو روپے

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ ۷۔ ۲۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور